پاکستانی ادب کے معمار
قتیل شفائی
(شخصیت اور فن)
تصنیف — اے حمید
تدوین — ڈاکٹر راشد متین

قتیل شفائی
(شخصیت اور فن)

قتیل شفائی

(شخصیت اور فن)

تصنیف ـــــ اے حمید

تدوین ـــــ ڈاکٹر [illegible]

اکادمی ادبیات پاکستان
اسلام آباد

ترتیب

دُعا

کھُلا کھُلا ہو یہ جہاں، دُھلا دُھلا سماج ہو
تری زمیں پہ اے خدا، محبتوں کا راج ہو

ہری بھری یہ وادیاں، بنی ہوں شاہزادیاں
بچھے بہار پاؤں میں، گلوں کا سر پہ تاج ہو

کسی وطن میں بھوک کا رہے نہ کوئی مسئلہ
نگر نگر، ڈگر ڈگر، اناج ہی اناج ہو

رکھیں نہ دل میں بیر ہم، سبھی کی چاہیں خیر ہم
سبھی کی ایک آن ہو، سبھی کی ایک لاج ہو

وہ دے جواب اس طرح، کھِلے گلاب جس طرح
مخاطب اپنے پیار کا، بہت ہی خوش مزاج ہو

سمندروں کی وسعتیں، دلوں میں ہم اُتار لیں
جو کل تلک نہ ہوسکا، وہ نیک کام آج ہو

پیش نامہ

وطن عزیز میں تخلیق ہونے والا ادب عالمی عصری ادب کے مقابلے میں فخر و اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان نے ادب کے میدان میں وہ نابغہ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں جن کی فکر و نظر کے حوالے دنیا بھر کے ادباء و شعراء کے لیے استفادہ کا باعث ہیں۔ ان بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا ہم پر کم سے کم یہ حق ہے کہ ہم ان کے کارہائے نمایاں اپنی آئندہ نسلوں تک بلا کم و کاست پہنچانے کے لئے اقدامات کریں۔

عرصہ دراز سے یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی کہ ہمارے عصری ادب کی ان جید شخصیات کے فکر و فن اور حالات زندگی کے بارے میں مستند معلومات یکجا کر کے شائقین علم و ادب تک پہنچائی جائیں۔ چند معروف پبلشروں نے محض چند ایک شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی اور ان کے فن کے بارے میں اکا دکا کتابیں شائع کی ہیں جبکہ باقی ادباء کے بارے میں اس نوع کی معلومات یا تو سرے سے دستیاب ہی نہیں یا پھر رسائل و اخبارات میں شائع شدہ مضامین کی صورت میں بکھری ہیں۔

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان جناب نذیر ناجی نے الحمداللہ یہ کام اپنے ذمے لیا ہے۔ اکادمی کے منصوبے کے مطابق سرزمین پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام

معتبر ادیبوں، شاعروں اور فکر و نظر کی حامل شخصیات، جنہیں بجا طور پر معماران ادب گردانا جا سکتا ہے، پر مشتمل ایک فہرست بلاامتیاز مرتب کی گئی ہے۔ طے پایا ہے کہ ان ادباء کے حالات زندگی، تخلیقی سفر اور ادبی مرتبہ پر مشتمل لگ بھگ ۱۵۰ صفحات کی ایک ایک کتاب مرحلہ وار شائع کی جائے تاکہ شائقین علم و ادب، محقق اور طالب علم یکساں طور پر اپنی کسی بھی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں محض ایک ہی کتاب کی ورق گردانی کرکے مطلوبہ معلومات حاصل کر سکیں۔ خصوصی طور پر کوشش کی گئی ہے کہ ہر ادیب کے بارے میں مجوزہ کتاب کسی ایسی شخصیت سے لکھوائی جائے جو ان کے فکر و فن سے مکمل طور پر آگاہ ہو، اس کے علاوہ مسودہ کسی دوسری بڑی ادبی شخصیت کو بھی دکھا دیا جائے تاکہ کتاب کی اشاعت میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے ہم اپنی اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہیں؟ یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے آپ کی جانب سے دی جانے والی تجاویز، ہماری آئندہ اشاعتوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔

سلیم اختر کیانی

ڈائریکٹر جنرل

اکادمی ادبیات پاکستان

ابتدائی حالات

ابتدائی حالات

قتیل شفائی کی پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہری پور ہزارہ (سرحد) میں ہوئی۔ والدین نے اورنگ زیب خان نام رکھا۔

راولپنڈی کے اسلامیہ پرائمری سکول میں چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول ہری پور ہزارہ سے پاس کیا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ وراثت میں جائیداد کافی ملی تھی۔ کچھ زمین فروخت کر کے کاروبار شروع کر دیا مزاج چونکہ کاروباری نہیں تھا اس لئے ابتدا ہی میں نقصان اٹھانا پڑا۔ ہمت نہ ہاری۔ مزید جائیداد فروخت کر کے سرمایہ کاروبار میں لگا دیا۔ مگر نا تجربہ کاری کی وجہ سے سارا سرمایہ ڈوب گیا اور قتیل شفائی میونسپل کمیٹی ہری پور ہزارہ میں بطور محرر ملازم ہو گئے۔ طبیعت شروع ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ ہری پور ہزارہ سے "نوجوان افغان" اور "پیغام سرحد" کے نام سے دو پرچے شائع ہوتے تھے۔ قتیل شفائی ان پرچوں کے لئے لکھنے لگا۔ کبھی کوئی غزل یا نظم اور کبھی کوئی افسانہ لکھ کر بھیج دیتا جو ان پرچوں میں چھپ جاتے۔ لیکن قتیل شفائی ہری پور ہزارہ کی میونسپل کمیٹی کی ملازمت سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ وہ راولپنڈی آگیا اور پنڈی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرک کے طور پر نوکر ہو گیا۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تو وہ ادب کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوا۔ ٹرانسپورٹ کمپنی نے

کچھ عرصے بعد قتیل کو برانچ مینجر کے عہدے پر ترقی دے کر کوہ مری میں تعینات کر دیا۔

اس دوران قتیل شفائی کا کلام مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو چکا تھا جن میں "ہمایوں" لاہور "نیرنگ خیال" لاہور، "ساقی" دہلی اور "سنگ میل" پشاور قابل ذکر ہیں۔ ادبی رسالے "سنگ میل" میں ہی قتیل شفائی کا ایک افسانہ بھی چھپا جس کا نام "خوبانیاں" تھا۔ اس کے بعد اس نے نثر میں لکھنے کی بجائے اپنی ساری توجہ شعر و شاعری پر مرکوز کر دی۔ لاہور سے اس زمانے میں مشہور ادبی رسالہ "ادب لطیف" شائع ہوتا تھا جس کے مالکان چوہدری برکت علی اور چوہدری نذیر احمد تھے۔ کوہ مری میں قتیل شفائی کو چوہدری نذیر احمد کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہمیں پرچے کے انتظامی اور ادبی امور کے سلسلے میں ایک آدمی کی ضرورت ہے اگر آپ یہ ذمے داری قبول فرمالیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔

قتیل شفائی نے حامی بھر لی اور کوہ مری سے لاہور آ گیا۔

فکر تونسوی پہلے سے "ادب لطیف" کے ایڈیٹر تھے۔ قتیل شفائی کو بھی بطور ایڈیٹر رکھ لیا گیا۔ تنخواہ ۷۴ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ ایک روز قتیل شفائی نے چوہدری نذیر احمد سے استفسار کیا کہ میری تنخواہ ۷۴ روپے کیوں ہے پچھتر روپے کیوں نہیں۔ چوہدری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "بس کچھ حالات و فسادات کی مجبوریاں ہیں۔" بعد میں فکر تونسوی نے قتیل شفائی کو بتایا کہ چوہدری صاحب تمہاری تنخواہ میں ایک روپے کا اضافہ اس لئے نہیں کر رہے کہ پھر انہیں میری تنخواہ میں بھی ایک روپے کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ اتنی قلیل تنخواہ بھی قسطوں میں دی جاتی تھی چنانچہ تین ماہ بعد قتیل شفائی نے "ادب لطیف" کی ادارت چھوڑ دی اور راولپنڈی واپس آ گیا۔

راولپنڈی کے گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی نے وہاں ایک غزل پڑھی جو بے حد پسند کی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قتیل شفائی شروع ہی سے بڑے اچھے اور دل میں اتر جانے والے شعر کہتا تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو دو آدمی قتیل شفائی کے پاس آئے ان میں سے ایک صاحب کا نام امان اللہ نیازی تھا اور دوسرے صاحب کا نام محبوب اختر تھا۔ انہوں نے قتیل شفائی کو پیش کش کی کہ ہم بمبئی میں ایک فلم بنا رہے ہیں آپ ہمارے ساتھ بمبئی چلیں اور ہماری فلم کے لئے گانے لکھیں۔ قتیل شفائی نے حامی بھر لی اور بمبئی جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ لیکن اس زمانے میں یعنی مارچ ۱۹۴۷ء میں بمبئی میں فسادات شروع ہو گئے اور قتیل شفائی بمبئی نہ جا سکا۔ اب ایسا ہوا کہ وہی فلم کمپنی بمبئی سے لاہور آگئی اور لکشمی چوک میں انہوں نے اپنا دفتر قائم کر لیا اور فلم کے سکرپٹ پر کام شروع ہو گیا۔ یہاں سے قتیل شفائی کے فلمی کیریئر کا آغاز ہوا۔ اس فلم کے ہدایت کار وہی محبوب اختر تھے۔ شیام سندر میوزک ڈائریکٹر تھے قتیل شفائی نے اس فلم کے لئے دو گانے لکھے جو ریکارڈ بھی ہو گئے۔ چندر کانت جس نے قتیل شفائی کی شاعری میں اہم کردار ادا کیا اسی فلم کمپنی کے دفتر میں اسے ملی۔ اسی دوران فسادات کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ فلم کمپنی کے حالات مخدوش ہو گئے۔ معاوضوں کی ادائیگی بھی پانچ پانچ چھ چھ روپوں کی قسطوں میں ہونے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر سینما ہاؤس بند پڑے تھے۔

قتیل شفائی نے ہمت نہ ہاری اس کے ادبی کیریئر کا آغاز ہو چکا تھا اور اپنی خوبصورت اور حسن و اثر آفرینی میں بہت سے منفرد نظر آنے والی شاعری کی وجہ سے وہ شہرت کی منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ لاہور ہی میں رہا لاہور سے اس زمانے میں ایک بڑا معیاری فلمی رسالہ "اداکار" شائع ہوتا تھا جس کے مالک سید

عطاءاللہ ہاشمی تھے۔ یہ ہفت روزہ پرچہ تھا ہاشمی صاحب نے قتیل شفائی کو اپنے پرچے "اداکار" کے عملہ ادارت میں شامل کر لیا۔ قمر اجنالوی پہلے سے وہاں کام کر رہے تھے۔ قتیل شفائی کی نظموں اور غزلوں میں ایسی بے ساختگی اور جینیئنی، آہنگ اور ترنم تھا کہ اس سے پہلے غزلوں اور نظموں میں کسی کے ہاں نظر نہیں آیا تھا۔ قتیل شفائی کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی ادبی شہرت کی بناء پر "ادب لطیف" والوں نے اسے دوبارہ اپنے پاس بطور ایڈیٹر بلا لیا۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۴۴ء میں ساحر لدھیانوی بھی لدھیانے سے ہجرت کر کے لاہور آگیا۔ قتیل شفائی اور ساحر لدھیانوی کی دوستی ہو گئی۔ دونوں نے مل کر بمبئی جانے اور وہاں فلم انڈسٹری میں بطور فلمی شاعر قسمت آزمانے کا پروگرام بنایا۔ ساحر لدھیانوی نے کہا میں پہلے بمبئی جاتا ہوں اور وہاں حالات ساز گار ہوتے ہی تمہیں بھی بلا لوں گا۔ لیکن ساحر لدھیانوی بمبئی جانے کی بجائے دلی ٹھہر گیا اور وہاں ادبی رسالے "شاہراہ" کا ایڈیٹر ہو گیا یوں قتیل شفائی کا بمبئی جانے کا پروگرام ایک بار پھر دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اس زمانے میں لاہور میں پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" کی کاغذی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قتیل شفائی کو اس فلم کے گانے لکھنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس فلم سے قتیل شفائی کی فلمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور وہ ادب کے علاوہ فلم کے میدان میں بھی اپنی خوبصورت شاعری کی شمعیں روشن کرتا ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ فلم "گمنیز" کے گانوں نے اس کی فلمی زندگی کا صحیح معنوں میں عروج شروع ہوا۔ اس فلم کے ہدایت کار اور کہانی نویس مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج تھے۔ غلام حیدر میوزک ڈائریکٹر تھے نور جہاں نے قتیل شفائی کی غزلوں اور گیتوں میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ قتیل شفائی کا ادبی رنگ اس فلم کے گیتوں اور غزلوں میں بھی بھرپور انداز میں کار فرما تھا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

لو چل دیئے وہ ہم کو تسلی دیئے بغیر
اک چاند چھپ گیا ہے اجالا کیے بغیر

یہ وادیاں یہ پربتوں کی شہ زادیاں
پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دلہن

میں کہوں جب آئیں گے مرے سجن
مرے سجن چلا بھی آ

حقیقت یہ ہے کہ وادیوں کو پربت کی شہزادیوں سے تشبیہ دینا نہ میں نے اس سے پہلے سنا تھا اور نہ ہی اس کے بعد۔ یہ قتیل شفائی کا حسنِ کلام اور اس کے رومانوی مزاج کا کرشمہ تھا۔ یہ وادیاں' یہ پربتوں کی شہ زادیاں! ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضمون' یہ تشبیہ قتیل شفائی کے خیال میں غیب سے آئی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے خود بلند و بالا کہسار اپنی وادیوں کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج سے پچپن برس پہلے قتیل شفائی نے اپنی ادبی اور فلمی نغمہ نگاری کا آغاز کیا۔ اب تک اس کے بیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ اڑھائی ہزار سے زیادہ فلمی نغمے لکھ چکا ہے اور ادبی تخلیق اور فلمی نغمہ نگاری کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

محبت میں کبھی سامانِ رسوائی نہیں کرتا
یہ ایسا جُرم ہے جو تیرا سودائی نہیں کرتا

شخصیت

اس وقت قتیل شفائی بڑھاپے کی پت جھڑ میں سے گذر رہا ہے۔ ایامِ جوانی کی بہاریں پیچھے رہ گئی ہیں۔ ماضی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو قتیل شفائی کی ایک شکل ابھرتی ہے۔ گھنے سیاہ گھنگھریالے بال' فراخ نتھنوں والی ستواں ناک' دراز قد' سرخ و سپید مسکراتا چہرہ' ہزارے کی مردانہ وجاہت کا بھرپور مظہر۔ خوش خوراک' خوش لباس' (وہ خوش خوراک اور خوش لباس آج بھی ہے۔) قتیل شفائی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہوئی۔ شاید میکلوڈ روڈ پر واقع ہفت روزہ رسالے "اداکار" کے دفتر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں یا "ادب لطیف" کے دفتر میں' ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ لیکن ملاقات ۱۹۴۷ء میں ہی ہوئی تھی۔ کیونکہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں مجھے یاد ہے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک ادبی اجلاس میں' میں اپنی کہانی پڑھ رہا تھا تو قتیل شفائی میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں بھی قتیل شفائی کی شاعری کا بڑا شہرہ تھا اور وہ ترقی پسندوں میں سب سے زیادہ مقبول اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور شاعر تھا۔ اس نے ادبی اور علمی شاعری کے میدان میں روزِ اول ہی سے ایک اہم مقام بنایا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت' مقبولیت اور فنِ شعر کی ندرتوں اور گوناگوں شعری تجربوں میں

اضافہ ہو رہا تھا۔

قیام پاکستان کے وقت اس نے رائل پارک کی ایک متروکہ بلڈنگ کا نچلا پورشن لے رکھا تھا۔ اسی سے ملحقہ عمارت کے نچلے کمرے میں ہم نے یعنی میں نے احمد راہی اور ساحر لدھیانوی نے کچھ روز قیام کیا تھا اور یہاں تقریباً روز ہماری محفلیں لگتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ اور عبوری دور تھا کہ ہمارے پاس کبھی پیسے ہوتے تھے کبھی نہیں ہوتے تھے لیکن ہم سب کی وضع داریاں برابر قائم تھیں۔ اچھا لباس پہنتے' عمدہ سگریٹ پیتے اور مال یا میکلوڈ کے ریستورانوں میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ اپنی کسی ادبی کاوش کا معاوضہ ملتا تو اگر سگریٹ چائے کا تھوڑا بہت ادھار ہوتا تو فوراً چکا دیتے۔ قتیل شفائی کو وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس معاشی زبوں حالی کے زمانے میں بھی میں نے اسے کسی دکاندار سے چائے سگریٹ کا ادھار کرتے نہیں دیکھا۔ لباس اس زمانے میں بھی صاف ستھرا اور اجلا پہنتا تھا۔ سردیوں میں کوٹ پتلون' سوٹ اور گرمیوں میں بوسکی کا یا سادہ سفید کپڑے کا کرتا پاجامہ یا پھر بش شرٹ اور پتلون۔ چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ سی رہتی تھی۔ اس کے معاشی عدم استحکام کا زمانہ زیادہ طویل نہیں رہا تھا۔ اس کی شاعری سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ وہ اپنی پہلی ہی غزل سے مشہور اور مقبول ہو گیا تھا اور دوسری یا تیسری فلم کے ساتھ ہی اس کے فلمی نغموں نے دھوم مچا دی تھی اور اس کے معاشی حالات بہتر سے بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فلمی شاعری میں بھی وہ ادبی شاعری کرتا تھا۔ شاعرانہ ذہن اسے قدرت کی طرف سے ودیعت تھا۔ فلمی نغموں میں اس کا اپنا الگ مخصوص ترنم و آہنگ موجود تھا۔چنانچہ فلمی نغمہ نگاری نے اسے فکر معاش سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ ہفت روزہ "اداکار" کا ایڈیٹر ہو گیا اس کے ساتھ ہمارا دوست قمر اجنالوی بھی تھا۔ قمر اجنالوی سے ہفتے میں دو ایک بار ملاقات ہوتی تھی لیکن قتیل

شفائی سے تقریبا روز کا ملنا تھا۔ "اداکار" کے دفتر میں ہی ہمارا خوبصورت دوست سعید شاہد بھی ہوتا تھا۔ قتیل شفائی نے اب مصری شاہ میں رحیم روڈ پر ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا ہمارا مکان بھی اسی سڑک پر تھا۔ قتیل شفائی اپنی فیملی کے ساتھ اس مکان میں رہائش پذیر تھا۔ یہاں تقریبا ہر روز ہی ہمارا ملنا ہوتا۔ قتیل شفائی روزانہ پورا تانگہ کرا کر گھر سے میکلوڈ روڈ جاتا تھا کبھی میں بھی اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ جاتا اور ہم دونوں اکٹھے رائل پارک آتے۔ قتیل شفائی "اداکار" یا اپنے کسی فلمی دفتر کی طرف چل دیتا اور میں ابن انشاء کے گھر یا امروز کے دفتر میں آجاتا۔ کسی وقت میں امروز کے آفس سے نکل کر قتیل شفائی کے پاس "اداکار" کے دفتر میں آجاتا۔ اور وہیں ہماری محفل لگ جاتی۔ ہم دوستوں کا ایک چھوٹا سا گروپ بن گیا تھا۔ قتیل شفائی ہمارے گروپ کا زندگی سے بھرپور مگر زمین باتیں کرنے والا ہمارا سب سے پیار دوست تھا اس نے زمانے کی بڑی سختیاں اٹھائی تھیں اور اپنوں اور بیگانوں کی ناانصافیاں بھگتی تھیں۔ان تلخ ترش اور شیریں تجربات نے اسے زمانے کو سمجھنا ہی نہیں سکھایا تھا بلکہ اسے انسانوں کی بھی سمجھ آگئی تھی۔ اپنی شاعری میں وہ جتنا جذباتی نظر آتا حقیقی زندگی میں وہ اتنا ہی حقیقت پسند تھا اور ہے اس شاعر رنگیں نوا کے کردار کے ان پہلوؤں پر بات آگے چل کر ہو گی۔ ابھی میں قتیل شفائی کی زندگی کے ابتدائی ایام کی بات کر رہا ہوں۔

اس نے کئی محبتیں کی ہوں گی جن کا ذکر اس کی شاعری میں درون پردہ ملتا ہے لیکن چندر کانتا نام کی ایک خاتون سے اپنی محبت کا معاملہ اس نے اپنے اشعار میں کھل کر بیان کیا ہے۔ بلکہ "چندر کانتا" کے عنوان سے اس نے ایک نظم بھی لکھی جو اس کے کسی شعری مجموعے میں بھی شامل ہے اس خاتون کو میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ جن دنوں ہم رائل پارک والی بلڈنگ کے ڈرائنگ روم میں رہا کرتے

تھے ان دنوں قتیل شفائی ساتھ والی بلڈنگ کے نچلے پورشن میں رہتا تھا اور چندر کانتا یہاں اس سے ملنے آیا کرتی تھی۔ چندر کانتا کی محبت نے قتیل شفائی کی شاعری پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک نیا جوش و جذبہ دیا۔ قتیل شفائی دوستوں اور دوستی کے معاملے میں شروع ہی سے ایثار پیشہ اور کشادہ ظرف رہا ہے۔ اختلافات وہ بہت کرتا ہے مگر ان اختلافات پر کبھی ذاتیات کا سایہ نہیں پڑنے دیتا۔ ترقی پسندی کے جن اصولوں اور نظریوں کو لے کر وہ چلا تھا آج بھی ان پر قائم ہے اور ان سے قتیل شفائی نے سرمو انحراف نہیں کیا۔ وہ دوستوں کا دوست ہے۔ کسی سے ناراضگی ہو تو اپنی ناراضگی کا اظہار منہ پر کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ناراضگی اپنے کسی بھی دوست کے ساتھ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ قتیل شفائی سے میری دوستی کو پچاس برس ہو گئے ہیں دوسرے پرانے دوستوں کے ساتھ اختلافات بھی پیدا ہوئے؟ لڑائی بھی ہوئی مگر قتیل شفائی کے ساتھ نہ کبھی میری لڑائی ہوئی اور نہ کبھی کوئی اختلاف ہی پیدا ہوا میں سمجھتا ہوں کہ اس میں قتیل شفائی کی عالی ظرفی اور معاملہ فہمی کا ہاتھ زیادہ ہے۔

پرانی یادوں کے دریچے میں بیٹھ کر ماضی میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو گزرے ہوئے ایام کی دھند میں کئی تصویریں ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہیں کئی شمعیں جھلملاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان شمعوں کی دھندلی روشنی میں اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ قتیل شفائی کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی ابھرتا ہے۔وہ "اداکار" رسالے کے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھا میرے ساتھ کسی موضوع پر مسکراتے ہوئے بات کر رہا ہے' ہم رائل پارک کے پرسٹل ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں' ادب لطیف کے دفتر میں بیٹھے کسی افسانے یا کسی نظم یا غزل پر بات کر رہے ہیں۔

قتیل شفائی کا پاک ٹی ہاؤس میں ہماری طرح سے روز کا آنا جانا نہیں تھا وہ صرف

اس روز پاک ٹی ہاؤس میں آتا جس روز وائی ایم سی اے ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس ہوتا۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد وہ بھی دوستوں کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں آجاتا اور ہماری محفل دیر تک جمی رہتی جن دنوں قتیل شفائی مصری شاہ میں ہمارے مکان کے قریب رہتا تھا انہی دنوں کی بات ہے کہ میں ایک بار شام کے وقت سائیکل پر نہروں نہر سیر کرتا مغل پورے کی طرف نکل گیا۔ واپسی پر رات ہو گئی ان دنوں رات کے وقت سائیکل کی بتی روشن رکھنا قانونی طور پر لازمی تھا۔ میری سائیکل پر کوئی بتی نہیں تھی یہ واقع مجھے بالکل ایسے یاد ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ میں مغل پورے سے نہروں نہر سائیکل چلاتا چلا آ رہا تھا کہ ایک جگہ ٹریفک کے سنتری نے مجھے روک لیا اور کاپی نکال کر بولا۔ نام بتاؤ۔ میں نے پوچھا۔ کیا بات ہے کہنے لگا۔

تم بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے ہو تمارا چالان ہو گا۔ نام بتاؤ۔

میں نے اسے بہت کہا کہ چالان نہ کرو۔ مگر وہ نہ مانا اور زیادہ زور دار آواز میں بولا۔ نام اور پتہ لکھواؤ۔ یاد رکھو۔ اگر غلط نام پتہ لکھوایا تو اندر کر دوں گا۔

میں نے کہا۔ لکھیں۔ قتیل شفائی

اس نے کہا۔

کیا کہا؟ حکیم شفائی

میں نے کہا۔ نہیں۔ قتیل شفائی

اور میں نے اسے قتیل شفائی کے مکان کو پورا پتہ لکھوا دیا۔ سنتری نے چالان کر کے رسید میرے ہاتھ میں دی اور کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہو جانا۔ اس بات کو پندرہ بیس دن گذر گئے ایک دن معلوم ہوا کہ پولیس کا ایک سپاہی قتیل شفائی کا پتہ پوچھتا پوچھتا اس کے مکان پر آیا اور اس نے قتیل شفائی کو بتایا کہ آپ کا سائیکل کا چالان ہوا تھا آپ تاریخ مقررہ پر عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔

آپ کے خلاف ضابطے کی کارروائی ہو گی۔ قتیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے تو زندگی میں کبھی سائیکل نہیں چلایا نہ میرے پاس سائیکل ہے۔ پھر میرا چالان کیسے ہو گیا؟ بعد میں میں نے قتیل شفائی کو بتایا کہ یہ کارستانی میری تھی؟

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ کوہ مری میں ایک مشاعرہ ہوا تو بہت سے ترقی پسند شاعر لاہور سے کوہ مری گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہاں ہمیں ایک سکول کے ہال کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ مری میں بڑی سردی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ قمر اجنالوی اچانک بیمار پڑ گیا۔ رات کا وقت تھا بارش ہو رہی تھی پھر بھی منتظمین مشاعرہ ڈاکٹر کو بلانے کے لئے دوڑ پڑے۔ قمر اجنالوی کو شاید اختلاج قلب کا عارضہ تھا اس کی حالت دیکھ کر ظہیر کاشمیری پر بھی کسی بیماری نے حملہ کر دیا۔ ظہیر کاشمیری کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا جسے وہ لاہور سے لے کر چلا تھا اور کوہ مری تک اسے کہیں نہیں چلایا تھا جب بھی کوئی موقع آتا ظہیر کاشمیری کہتا۔

میرے پاس سو کا نوٹ ہے' کھلا ایک روپیہ نہیں ہے

قمر اجنالوی کو سنبھالتے سنبھالتے ہم لوگ ظہیر کاشمیری کی وجہ سے بھی پریشان ہو گئے۔ قتیل شفائی نے کہا۔

ظہیر کاشمیری پر بیماری کا حملہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ اس نے سو روپے کا نوٹ نہیں تڑوایا۔ اس کا سو روپے کا نوٹ تڑوا دو۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔

کسی دوست نے کہا۔

میرا خیال ہے یہ اور زیادہ بیمار ہو جائے گا۔ اسے مزید ایک سو روپے کا نوٹ چندہ کر کے دے دو۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔

قیام پاکستان کے شروع شروع کا زمانہ تھا جالندھر میں پاکستان کا ہائی کمشن ہوا

کرتا تھا۔ یوم اقبال آیا تو پاکستانی ہائی کمشن کی جانب سے جالندھر میں ایک مشاعرے کا اعلان کیا گیا جس میں پاکستان سے شاعر حضرات کو بھی بلایا گیا۔ انار کلی میں؟ سلیم طاہر کی میڈیکوز کی دکان پر سب شاعروں نے اپنے اپنے پاسپورٹ جمع کرا دیئے کیونکہ سلیم طاہر نے ان پر ویزے لگوانے تھے۔ میں نے بھی اپنا پاسپورٹ اسے دے دیا۔ شہرت بخاری نے پوچھا۔

تم تو شاعر نہیں ہو۔ تم کیسے جاؤ گے؟

میں نے کہا۔ یار میں اسی بہانے اپنا آبائی شہر امرتسر دیکھنا چاہتا ہوں۔

قتیل شفائی نے مجھ سے کہا۔

فکر نہ کرو۔ میں تمہیں شاعر بنا دوں گا۔ میں تمہیں ایک غزل لکھ کر دے دوں گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بھی اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ ویزا لگوا کر جالندھر پہنچ گیا اور وہاں قتیل شفائی کی دی ہوئی غزل اپنے نام سے پڑھ ڈالی۔ پاکستان ہائی کمشن کی طرف سے شاعروں کی رہائش کا انتظام ایک پرانے سکول کے بوسیدہ سے بڑے ہال کمرے میں چارپائیاں ڈال کر کیا گیا تھا۔ قتیل شفائی جالندھر میں اپنے کسی دوست کے ہاں ٹھہرا تھا۔ ہمارے نہانے کا بھی معقول انتظام نہیں تھا۔ صبح میں بڑی مشکل سے نہانے کے بعد غسل خانے سے نکلا تو سامنے قتیل شفائی کھڑا تھا کہنے لگا۔

تم میرے ساتھ کیوں نہیں آ گئے؟ یہاں تو نہانے کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ بات قتیل شفائی کے مزاج کا حصہ ہے اپنے کسی دوست کو تکلیف میں دیکھے تو اس کی تکلیف دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے۔ جن وادیوں میں وہ کھیل کود کر جوان ہوا اس کا دل ان وادیوں کی طرح کشادہ ہے۔ قتیل شفائی ہری پور ہزارے

میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ پاکستان کے حسین ترین نیم پہاڑی علاقوں میں شامل ہے۔ یہاں یوکلپٹس کے درخت ہیں اور پھل دار باغ ہیں۔ ٹھنڈے شفاف چشموں کا پانی مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا کر گذرتا ہے چاندنی راتیں گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے مہکتی ہیں۔ قتیل کا بچپن انہی چشموں پھل دار باغوں اور گلاب اور چنبیلی کی خوشبوؤں میں گزرا۔ ہمیں اس کی شاعری میں ان چشموں کا ترنم چاندنی راتوں کی سرگوشیاں اور گلاب چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ ان خوشبوؤں چاندنی سے مہکتی راتوں اور چشموں کے ترنم کو قتیل نے لفظوں کے سانچوں میں ڈھال کر اپنے اظہار کی ایک ایسی راہ نکالی جو اس کے ہم عصر شعراء میں سب سے الگ اور منفرد ہے۔

بچپن میں وہ چشموں کے کنارے باغوں میں تتلیوں کو اڑتے دیکھ کر ان کے پیچھے دوڑتا۔ انہیں پکڑنے کی بجائے انہیں قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ تتلیاں بچپن میں اس کے ہاتھ نہ آئیں مگر جب اس نے شاعری شروع کی تو اس کے شعروں میں ان تتلیوں کے سارے رنگ نمودار ہوتے چلے گئے۔ جو طلسم ہری پور ہزارے کی وادیوں میں اس کے مترنم چشموں' پر سکون چاندنی راتوں اور ایک پھول سے دوسرے پھول پر لہراتی تتلیوں میں ہے وہی طلسم ہمیں قتیل شفائی کی شاعری میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ قدرت کے حسن کا شدید احساس رکھنے اور قدرت کے مظاہرات کی سرگوشیاں سننے والے شاعروں کے ساتھ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عام زندگی میں بھی نیچر کے احساس حسن میں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں' اور مادی زندگی کے ضابطوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مگر قتیل شفائی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی وہ فکر سخن کرتے ہوئے تو قدرت کے حسن میں شرابور ہوتا ہے لیکن اپنی مادی زندگی کی ذمے داریوں سے بھی غافل نہیں ہے۔ اپنے معاشرے اور معاشرے کے ضابطوں

کی طرف سے اس پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں انہیں وہ پوری دیانتداری سے پورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کی طرح اس کی مادی اور عائلی زندگی بھی کامیاب اور کامران ہے۔

سمن آباد کے آس پاس نئی نئی کالونیاں آباد ہونا شروع ہوئیں تو قتیل شفائی نے یہاں اپنا ایک مکان بنوا لیا۔ یہ مکان غالب کالونی میں تھا وہ مصری شاہ والے مکان سے اٹھ کر اپنے نئے مکان میں آگیا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ غالب کالونی والے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے سمن آباد میں ہی ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگا تھا۔ یہ اپن ٹائپ کا چھوٹا سا خوش نما مکان تھا جس کے برآمدے میں لکڑی کی جافری لگی تھی اور برآمدے ہی میں کھانے کی میز ہوتی تھی یہاں میں ایک بار صبح کے وقت قتیل شفائی سے ملنے گیا تو وہ ناشتہ کر رہا تھا۔ اس نے میرے لئے چائے بنائی اور نوٹ پر بالائی لگا کر دی یہاں کچھ دیر رہنے کے بعد قتیل شفائی نے موجد آرٹسٹ اور قاسمی صاحب کے ساتھ مل کر غالب کالونی میں تین پلاٹ خریدے اور وہاں مکان بنوائے۔ قتیل شفائی آج بھی اپنے غالب کالونی والے مکان میں رہائش پذیر ہے۔

گلبرگ لاہور میں والڈ روف ہوٹل نیا نیا شروع ہوا تھا۔ یہ کافی دیر پہلے کی بات ہے یہ پرانے انگریزی فیشن کا دو منزلہ ہوٹل تھا شاید اب بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے وہاں گلوکار مہدی حسن کے ساتھ ایک شام منائی گئی دوسرے شاعر ادیب دوستوں کے ساتھ میں اور قتیل شفائی بھی وہاں موجود تھے۔ یہ مہدی حسن کے عروج کا زمانہ تھا اور قتیل شفائی کا عروج تو اس کے پہلی غزل ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ برصغیر کے گلوکار قتیل شفائی کے کلام کو گا کر فخر محسوس کرتے تھے گلبرگ والے والڈ روف ہوٹل کی محفل سجی ہوئی تھی مہدی حسن نے کہا۔

حضرات! اب میں آپ کو اپنی پسند کی ایک غزل سنانا چاہتا ہوں۔ یہ غزل میرے

محترم دوست، بھائی اور عظیم شاعر جناب قتیل شفائی صاحب کی ہے۔

اس کے بعد مہدی حسن نے قتیل شفائی کی غزل گانی شروع کی تو محفل میں ایک طلسم کا سماں بندھ گیا۔ غزل یہ تھی۔

ہزار بار لبوں پر سجائیں گے اس کو
وہ گیت ہے تو سدا گنگنائیں گے اس کو

کہاں ہے پیار کی جنت اگر وہ پوچھے گا
ہم اپنے دل کا دریچہ دکھائیں گے اس کو

وہ جس کا پیار ابھی ادھ کھلے گلاب سا ہے
بنیں گے بادِ صبا، گد گدائیں گے اس کو

تعلقات کے شیشے میں کیسے بال آیا
یہ داستان کبھی پھر سنائیں گے اس کو

قتیل ہوش میں جب تھے تو اس کو چاہا تھا
یہ بات ہوش گنوا کر بتائیں گے اس کو

مہدی حسن کی آواز اور قتیل شفائی کا کلام، محفل پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

چندر کانتا سے تعلق خاطر قتیل شفائی کی شاعری میں ہمیں کئی روپ میں ملتا ہے۔ کہیں رمز کے انداز میں اور کہیں نمایاں ہو کر اس کے ایک شعری مجموعے کی یہ غزل ملاحظہ ہے۔

کہوں کیا فسانہ غم اسے کون مانتا ہے
جو گذر رہی ہے دل پر مرا دل ہی جانتا ہے

اسے میں نصیب جانوں کہ بشر کی خود فریبی
کوئی بھر رہا ہے دامن کوئی خاک چھانتا ہے

ترا یوں خیال آیا مجھے غم کی دوپہر میں
کوئی جیسے اپنا آنچل میرے سر پہ تانتا ہے

میں نظام زر کی دیوی سے قتیل آشنا ہوں
کہیں نام اس کا بانو' کہیں چندر کانتا ہے

مصری شاہ رحیم روڈ پر قتیل شفائی اور میں جس کرائے کے مکان میں رہتے تھے وہ ہمارے ایک مشترکہ دوست اقبال میر کا تھا۔ اقبال میر ہمارا بے تکلف دوست تھا اور شعر و ادب سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔ اس زمانے میں ہی قتیل شفائی کی فلمی مصروفیات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کے خوبصورت فلمی نغموں کی گونج برصغیر کی فضاؤں میں گونجنے لگی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا وقت ضرور نکال لیتا تھا وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں بھی آتا۔ اپنا تازہ کلام پڑھتا کسی نہ کسی ریستوران میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے بھی پیتا۔ اس طرح مجھے یاد ہے ہم ایک روز انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو میں قتیل شفائی سے کہا۔

آؤ چینیز لنچ ہوم میں چل کر چائے پیتے ہیں پاک ٹی ہاؤس میں بہت رش ہو گا۔

ہم وائی ایم سی اے کی بلڈنگ کے باہر کھڑے تھے۔ ہمارے دوسرے شاعر ادیب دوست ہی ہمارے ساتھ ہی تھے اور وہ باتیں کرتے ہوئے پاک ٹی ہاؤس کی طرف جا رہے تھے قتیل شفائی نے کہا۔

"چینیز لنچ ہوم میں بھی رش ہو گا کسی اور جگہ چلتے ہیں اچانک لوایینیگز ریستوران کا خیال آگیا۔ یہ خاموش خاموش پر سکون ریستوران مال روڈ چیئرنگ کراس میں اس جگہ ہوا کرتا تھا جہاں بعد میں پی آئی اے والوں نے اپنا دفتر بنا لیا تھا اس ریستوران کی فضا چائے کے لئے بے حد ساز گار تھی ریستوران میں ایک تو لوگ بہت کم ہوتے تھے دوسرے اندر داخل ہوں تو یوکلپٹس کی خوشبو آپ کا استقبال کرتی تھی۔ ریستوران والوں نے میز کے گلدانوں میں یوکلپٹس کی شاخیں سجائی ہوتی تھیں جن کی ٹھنڈی ٹھنڈی مہک فضا میں پھیلی ہوتی تھی۔ لاہور کے ریستورانوں خاص طور پر مال روڈ کے ریستورانوں میں اور لوایینیگز کا ریستوران ایک خواب کی طرح تھا۔ آج بھی جب میں اس ریستوران کو یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے خواب میں اسے دیکھا تھا۔ اور خواب میں بھی وہاں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا تھا۔ میں نے قتیل سے کہا۔ "لوایینیگز میں چلتے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ہاں لورینیگز میں ہم اطمینان سے چائے پی سکتے ہیں۔"

لورینیگز کی جانب ادیبوں' شاعروں کا ابھی رخ نہیں ہوا تھا ان کے گڑھ پاک ٹی ہاؤس' چینیز لنچ ہوم اور کافی ہاؤس ہی تھے یہاں سے اٹھ کر ادیب اور شاعر زیادہ سے زیادہ شیزان تک مار کرتے تھے۔ لورینیگز میں کبھی کبھار ہی کوئی ادیب یا شاعر دیکھا جاتا تھا۔ مگر میں اور میرا پینٹر دوست انور جلال شمزا اور نواز لورینیگز میں دوسرے تیسرے روز ضرور جا کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ میں اور قتیل شفائی مال روڈ پر سے گذرتے لورینیگز میں آگئے۔ مارچ اپریل کا خوش بہار موسم تھا ریستوان میں

داخل ہوتے ہی یوکلپٹس کی خوشبو آئی فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ چھوٹی گول میزیں قرینے سے لگی تھیں ہر میز پر گلدان رکھا ہوا تھا جس میں یوکلپٹس کی شاخیں لگی تھیں۔ چند ایک گاہک دور دور بیٹھے خاموشی سے چائے پی رہے تھے مجھے لورینیگز ریستوران میں آکر ہمیشہ اسی بات کا احساس ہوتا تھا کہ میں چائے کے وطن میں آگیا ہوں۔ چائے کے شہر میں آگیا ہوں چائے کے اپنے گھر میں آگیا ہوں جہاں چائے پیدا ہوتی تھی بڑھی پلی اور جوان ہوئی تھی شیشے کی دیواروں پر باریک پردے گرے ہوئے تھے جن میں سے غروب ہوتے سورج کی روشنی گزرنے کے بعد اور زیادہ دھیمی اور رومانٹک ہو رہی تھی۔ میں اور قتیل شفائی کونے والی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بیرا قالین کے فرش پر بے آواز قدموں سے چلتا ہمارے پاس آیا۔ ہم نے چائے اور پیسٹری کا آرڈر دیا اور باتیں کرنے لگے۔

اس زمانے میں ہم نے مال روڈ کے سارے ریستوانوں کا سروے کیا ہوا تھا پاک ٹی ہاؤس کی چائے اتنی اچھی نہیں ہوتی تھی اس کی چائے بہت مشہور تھی چینیز لنچ ہوم کا کھانا بہت مزے دار ہوتا تھا۔ شیزان کی پیسٹریاں بہت لذیذ ہوتی تھیں اور لوراینیگز کی چائے کا سارے لاہور میں کہیں جواب نہیں تھا چینک میں سے نکل کر پیالی میں گرتی تو ایسے لگتا جیسے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کی آبشار گر رہی ہے۔ بغیر دودھ کے چائے کو پیئیں تو محسوس ہوتا ہے کہ جنوب ایشیاء کے چائے کے باغوں کی خوشبو سیال چاندنی بن کر حلق سے اتر رہی ہے دودھ ملا کر پیئیں تو ایسے لگتا جیسے آدمی سرد کہرے میں کسی باغ میں سے گذر رہا ہو اور اچانک کسی طرف سے ہسپانیہ کے سیاہ گلابوں کی خوشبور آئی ہو لوراینیگر ریستوران میں آکر مجھے جب کبھی مغربی یا مشرقی ایشیاء کے چائے کے باغوں کی سیر کرنی ہوتی تھی تو میں یہاں بیٹھ کر بغیر دودھ کی چائے پیتا تھا۔ اگر ہسپانیہ کے سیاہ گلابوں کی خوشبو سے ملاقات کرنی ہوتی

تھی تو چائے میں تھوڑا سا دودھ ملا کر پیتا تھا۔ اس روز قتیل شفائی میرے ساتھ تھا میں نے سوچا آج سرد کرے والے باغ میں سے گزر کر ہسپانیہ کے سیاہ گلابوں سے ملاقات کرنی چاہیے۔ چنانچہ جب چائے آئی تو میں نے پیالیوں میں تھوڑا تھوڑا دودھ بھی ملا دیا۔ قتیل شفائی چائے کی معاملے میں میری طرح نازک مزاج نہیں ہے اس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور میں نے چائے میں کتنا دودھ ملایا ہے۔ جب اس نے اپنی پیالی دیکھی تو کہنے لگا۔

اس میں تھوڑا اور دودھ ڈال دو

میں نے اس کی پیالی میں مزید دودھ ڈال دیا اور ہسپانیہ کے سیاہ گلاب ہسپانیہ واپس چلے گئے لیکن پاکستان اور خاص طور پر پوٹھوہار کے گلابوں کے سرخ اور گلابی پھول میرے پاس قتیل شفائی کی صورت میں موجود تھے کچھ دیر ہم انجمن ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کرتے رہے میں نے اسے کہا۔

یہ فضا اس قسم کی باتیں کرنے کی نہیں ہے۔ یہ فضا تم سے کسی اور بات کا تقاضا کر رہی ہے؟

وہ ہنس پڑا۔ کس بات کا

میں نے کہا۔ یار اپنا کوئی شعر سناؤ تاکہ اس فضا میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔

کہنے لگا۔ اچھا تو پھر تمہیں اپنا ایک گیت سناتا ہوں۔

میں نے کہا۔

میں اسی شرط پر گیت سنوں گا کہ اس کے بعد تم اپنی کوئی غزل بھی سناؤ گے۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ شرط منظور ہے

قتیل شفائی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا جیسے گیت یاد کر رہا ہو پھر اس نے اپنا ایک خوبصورت اور بڑے نازک احساس والا گیت تحت اللفظ سنایا۔

آ میرے پیار کی خوشبو
منزل پہ تجھے پہنچائے

تو چلتا چل ہمراہی
مری زلف کے سائے سائے

سورج کی طرح میں چمکوں
پر مجھ میں دھوپ نہیں ہے

جو شعلہ بن کر لپکے
میرا ایسا روپ نہیں ہے

میرا ایسا روپ نہیں ہے
جو نظروں کو جھلسائے

تو چلتا چل ہمراہی
مری زلف کے سائے سائے

میں بدلی ہوں ساون کی
میں چیت کی ہوں پروائی

مری سانسوں کی شہنائی
نت میگھ ملہار سنائے

تو چنتا چل ہمرا ہی
مری زلف کے سائے سائے

تو چنتا صرف مجھی کو
پہچان تجھے گر ہوتی

انصاف سے تو خود کہتا
یہ کنکر ہے یہ موتی

یہ کنکر ہے یہ موتی
مرا پیار تجھے سمجھائے

اس کے بعد قتیل شفائی نے میری فرمائش پر مجھے اپنا ایک اور گیت سنایا جو اس کے گیت سناتے ہوئے مجھے یاد آگیا تھا اور میں اب اس کی زبانی یہ گیت سننا چاہتا تھا۔

انکھیاں جھوٹ نہ بولیں
پہلے دل کا حال کہیں پھر اپنے بھید بھی کھولیں
انکھیاں جھوٹ نہ بولیں
ان پہ گزری جیسی جیسی
بات کریں یہ ویسی ویسی
روتے روتے کبھی ہنسیں
کبھی ہنستے ہنستے رولیں

اکھیاں جھوٹ نہ بولیں

بھید چھپائیں جب یہ کوئی
لگتی ہیں کچھ کھوئی کھوئی

لیکن پلک جھپک میں پھر یہ پیار کی راہ ہولیں۔

اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
کاجل کے سنگ بہتے بہتے
سیج بچھا کر سپنوں کی تھوڑی دیر کو سولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں

گیت کے اپنے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں گیت لکھتے وقت شاعر کو ان احساسات کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ قتیل شفائی اس نازک کام میں کہاں تک کامیاب ہے؟ یہ ہم آگے چل کر بات کریں گے جب ہم اس کے فن کا جائزہ لیں گے اس وقت تو میں لاہور کے خواب آلود ریستوران لورینیگز میں بیٹھا ہوں۔ سامنے قتیل شفائی بیٹھا ہے درمیان میں لورینیگز کی طلسمی چائے کی شہزادی بیٹھی ہے یہاں فن اور تنقید کی بات کرنی کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی۔ اور پھر میں اس وقت قتیل کے گیتوں پر تنقید کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ ابھی مجھے اس کی ایک غزل بھی سننی تھی اور قتیل شفائی بھی ہر کسی کو اپنا کلام نہیں سنایا کرتا تھا۔ یہ میرے لئے واقعی ایک عزاز تھا کہ وہ خود اپنا کلام مجھے سنا رہا تھا مجھے قتیل شفائی کی ایک غزل بڑی پسند تھی۔ میں نے اسی کی فرمائش کی اور کہا کہ وہ غزل میں اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ یہ غزل اس نے جب ایک مشاعرے میں پڑھی تو اس کے آگے سوائے ناصر کاظمی کے کسی دوسرے شاعر کی غزل نہ ٹھہر سکی تھی۔ میں نے غزل کے مطلع کا پہلا مصرعہ اسے

سنایا تو وہ مسکرانے لگا۔ یہ غزل خود مجھے بھی پسند ہے۔

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

باہر مال پر موسم بہار کا دن غروب ہو چکا تھا اور باریک پردوں پر دن کی روشنی غائب ہو رہی تھی۔ لورینیگز کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ قتیل شفائی نے گھڑی پر وقت دیکھ کر کہا۔

چلو یار اب چلتے ہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے سٹوڈیو بھی جانا ہے۔

مجھے سن یاد نہیں۔ لیکن یہ بات بھی کافی پرانے دنوں کی ہے۔ قتیل شفائی کی فلمی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ اس کے فلمی نغموں نے ہر طرف دھوم مچا رکھی تھی ان دنوں ایک مطربہ سے اس کا تعلق خاطر بھی اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا میں کسی کام سے اسے ملنے گیا ہوا تھا ہم دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ہمارے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا قتیل نے کہا۔

میرا ایک نیا گانا فلم کے لئے ریکارڈ ہوا ہے وہ تمہیں سناتا ہوں؟

اور اس نے ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ کو سیٹ کر کے بٹن دبا دیا۔ یہ گانا اسی مطربہ کی آواز میں تھا جو ان دنوں اس کی شاعری پر چھائی ہوئی تھی۔

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ
سکوت مرگ طاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہو گا
یہی قسمت ہماری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

تمہیں کیا آج بھی کوئی اگر ملنے نہیں آیا
یہ بازی ہم نے ہاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

کہے جاتے ہو رو رو کر ہمارا حال دنیا سے
یہ کیسی راز داری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آجائے گی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

گانا ختم ہوا تو قتیل شفائی نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا اور پوچھا۔

کیا خیال ہے؟

میں نے اسے بتایا کہ غزل اس کے اپنے خاص انداز کی بہترین غزل ہے۔ (یہ غزل میں پہلے بھی اس کی زبانی سن چکا تھا) غزل کی دھن بھی خوبصورت تھی اور میں نے زور دے کر کہا۔

اور گانے والی نے گائی بھی جی لگا کے ہے۔

وہ مسکرانے لگا۔

وہ بہت اچھا گاتی ہے

میں نے کہا۔ یہاں تو اس کا جی بھی لگا ہوا تھا اس لئے اس نے مزید اچھی طرح گائی ہے۔

اس مطربہ سے قتیل شفائی کا تعلق خاطر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سبھی جانتے تھے ویسے بھی فلمی دنیا میں اس قسم کے رومانس کے ٹریک چلا ہی کرتے ہیں اور یہ رومانس محض وقتی ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کا رنگ جمتا ہے اور پھر اتر جاتا ہے لیکن یہاں معاملہ ایسا ہو گیا تھا کہ مطربہ سنجیدہ یعنی سیریس ہو گئی تھی اور وہ قتیل شفائی سے شادی کرنے کی خواہش مند تھی میں نے قتیل شفائی سے پوچھا۔ پھر تم نے کیا سوچا ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔

قتیل شفائی کہنے لگا۔

جب میری اپنی برادری میں شادی ہوئی تھی تو میں نے اس روز عہد کیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا۔

یہ عہد اس نے اپنے آپ سے بھی کیا تھا اور اپنی فیملی سے اس کی جو اخلاقی ذمے داریاں وابستہ تھیں ایک طرح سے ان سے بھی کیا تھا۔ قتیل شفائی اس عہد پر ساری زندگی قائم رہا اور آج بھی قائم و دائم ہے۔ میں پہلے بھی اس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ وہ دنیاوی معاملات میں بھی بڑا ذمے دار ہے اس کی ساری زندگی میرے سامنے ہے اس نے اپنی گھریلو اور گھر کے باہر کی ذمے داریوں کو بطریق احسن نبھایا ہے اور نبھا رہا ہے اس اعتبار سے بھی اس کی زندگی ایک خوش حال اور کامیاب زندگی رہی ہے ورنہ اس نے اپنے اوقات کار کا غالب حصہ جس ماحول میں بسر کیا ہے وہاں بڑے بڑوں کے پاؤں پھسلتے ہم نے دیکھے ہیں۔ مگر قتیل شفائی نے اپنے کردار کے اس پہلو کو آنچ نہیں آنے دی۔ قتیل شفائی کی حس مزاح بھی بڑی تیز ہے وہ بات میں سے بات

نکالتا ہے اور موقع محل کے مطابق بڑے کاٹ دار فقرے کہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طبعاً ہنس مکھ واقع ہوا ہے کبھی کبھی کسی شعر پر بڑی اچھی پیروڈی بھی کرتا ہے لیکن جب اس کے ایک شعر پر کسی دوست نے پیروڈی کی تو اس نے اس کا برا نہیں مانا بلکہ داد دی تھی۔ قتیل شفائی کی ایک غزل کا شعر ہے۔

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

اس پر ایک دوست نے یوں پیروڈی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

قتیل شفائی کی یہ غزل بڑی خوبصورت غزل ہے میں اس غزل کے دو تین شعر آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

ان ہی ایام میں میرا بھی فلم سٹوڈیوز میں آنا جانا رہتا تھا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میرے اکثر دوست کسی نہ کسی طور پر فلمی دنیا سے وابستہ تھے میں کسی فلم پروڈکشن کے دفتر یا فلم سٹوڈیو میں جاتا تو اکثر اوقات قتیل شفائی سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ایک فلم سٹوڈیو میں کسی فلم پرودکشن کے دفتر میں گیا تو وہاں ایک آدمی اور ایک لڑکی بیٹھی تھی آدمی کو میں جانتا تھا اس کی شہرت اچھی نہیں تھی وہ لڑکی کو فلمی دنیا کے سبز باغ دکھا رہا تھا لڑکی سر جھکائے خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا اس آدمی نے میری موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دی اور لڑکی سے باتیں کرتا رہا باتیں ایسی تھیں جو فلمی دنیا میں عام سننے میں آتی تھیں۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ اگلی فلم میں وہ اسے سائیڈ ہیروئن کا رول دلائے گا وہ بڑی جلدی ہیروئین بن جائے گی وغیرہ وغیرہ لڑکی نے کمزور سی شرمیلی آواز میں پوچھا مجھے رات کو تو یہاں نہیں آنا پڑے گا نا؟

وہ آدمی بولا۔

اگر شوٹنگ رات کو ہو گی تو آنا پڑے گا ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری شوٹنگ دن کو رکھوا لیا کروں گا۔

وہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اخبار ذرا ہٹا کر لڑکی کو غور سے دیکھا وہ کسی شریف گھر کی بہو بیٹی لگتی تھی اس دوران وہ آدمی یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ میں ابھی ڈائریکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیسے آگئی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے معلوم ہوا کہ وہ کسی دوسرے شہر کی رہنے والی ہے ماں سوتیلی ہے باپ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اسے

مارتا ہے وہ گھر سے بھاگ کر آئی ہے لڑکی واقعی شریف گھرانے کی تھی اور حالات نے
اسے تباہی کی دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا میں جانتا تھا کہ وہ آدمی اسے تباہی کے جوالا
مکھی میں دھکا دینے والا ہے میں نے لڑکی سے کہا۔

میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اصلی فلم ڈائریکٹر سے ملواتا ہوں۔

مجھے معلوم تھا کہ ساتھ والے فلم سٹوڈیو میں قتیل شفائی موجود ہے میں لڑکی کو اس
کے پاس لے آیا اور الگ لے جا کر ساری بات کہہ دی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ
اس لڑکی کو کسی طرح اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔ قتیل شفائی سوچ میں
پڑ گیا۔ معاملہ واقعی سوچنے کا تھا اس دوران ہم نے لڑکی کو تھوڑا بہت سمجھایا بجھایا۔ وہ
رونے لگی۔ اور اپنے گھر واپس جانے پر راضی ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے اس
کے گھر لے کر کون جائے۔ بڑا نازک معاملہ تھا۔ قتیل شفائی کے کچھ وفادار شاگرد ہمیشہ
اس کے ساتھ رہے ہیں اس وقت دن کا ایک بجا تھا ہم نے لڑکی کے لئے کھانا
منگوایا۔ اس کا گھر دوسرے شہر میں تھا جو لاہور سے گھنٹے سوا گھنٹے کی مسافت پر تھا۔
قتیل شفائی نے اپنے ایک وفادار اور قابل اعتبار شاگرد کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ لڑکی کو اس
کے گھر چھوڑ کر آئے اور اس کو باپ کے حوالے کرے۔

چار بجے تک لڑکی واپس اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ جب تک اس کے شاگرد نے
واپس آکر قتیل شفائی کو یہ نہیں بتا دیا کہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی ہے قتیل
شفائی پریشان رہا بار بار یہی کہتا کہ دوسری شادی کرنے کے بعد لوگ اپنی پہلی اولاد سے
متنفر کیوں ہو جاتے ہیں؟ جب اس کے شاگرد خاص نے واپس آکر بتایا کہ لڑکی اپنے
گھر خیر خیریت سے پہنچا دی گئی ہے تو قتیل شفائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ قتیل شفائی
کے کردار اور اس کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بھی

حفاظت کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا بھی احترام کرتا ہے۔

ریڈیو پر جو فلمی ریکارڈ بجائے جاتے تھے ان میں فلم ڈائریکٹر کا نام تو نشر کیا جاتا تھا مگر جس شاعر نے وہ نغمہ لکھا ہوتا تھا اس کا نام براڈ کاسٹ نہیں کیا جاتا تھا حالانکہ اس کا نام ریکارڈ پر لکھا ہوتا تھا۔ قتیل شفائی نے پریس میں شاعروں کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی کے خلاف پریس میں بیان دے کر آواز اٹھائی اور ریڈیو والوں سے مطالبہ کیا کہ موسیقار کے نام کے ساتھ شاعر اور نغمہ نگار کا نام بھی نشر کیا جائے۔ یہ بڑا جائز مطالبہ تھا اب دوسرے شاعر بھی قتیل شفائی کے بیان کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس احتجاج میں سب سے نمایاں آواز قتیل شفائی کی تھی۔ یہ بڑا جائز مطالبہ تھا اخبارات نے قتیل شفائی کے بیان کے حق میں ادارتی نوٹ لکھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریڈیو والوں کو اس جائز مطالبے کے آگے سر جھکانا پڑا اور موسیقاروں کے ساتھ شاعروں کے نام بھی براڈ کاسٹ ہونے لگے۔ قتیل شفائی نے شاعروں کے ایک جائز حق کے لئے آواز بلند کی اس کے لئے بھرپور مہم چلائی اور اس میں کامیاب ہوا اور دوسرے شاعروں کو بھی ان کے جائز حقوق دلوائے اس کا سہرا قتیل شفائی کے سر جاتا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن سے جو فلمی نغموں کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے ان نغموں کی را ئیلٹی شاعروں کو ادا نہیں کی جاتی تھی۔ صرف ریکارڈنگ کمپنی کی رائیلٹی ادا کر دی جاتی تھی جس میں سے شاعروں اور موسیقاروں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا قتیل شفائی نے اس استحصال کے خلاف بھی آواز اٹھائی اخباروں میں بیان دیے اخباروں نے بھی شاعروں کے اس جائز حق کی حمایت میں لکھا۔ چنانچہ موسیقاروں اور شاعروں کو بھی رائیلٹی ملنا شروع ہو گئی۔ شروع شروع میں ریڈیو پر شاعروں کو ایک بار نغمہ بجانے کے چار آنے رائیلٹی ملتی تھی قتیل شفائی کی کوششوں سے اس رائیلٹی میں مزید اضافہ ہوا اور اب رائیلٹی کی رقم بڑی مناسب ہو گئی ہے۔ مجھے یاد ہے یہ

سن ۶۴ کی بات ہے ریڈیو پاکستان لاہور کا عملہ اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا میں نے قتیل شفائی کو سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ خیریت تو ہے۔ اس نے کہا۔

"شاعروں کی رائیلٹی کے چیک بڑی دیر بعد بنتے ہیں اور صحیح بھی نہیں بنتے۔ میں اس سلسلے میں سٹیشن ڈائریکٹر سے بات کرنے آیا ہوں۔"

میں ریڈیو پاکستان لاہور سے بطور سٹاف آرٹسٹ ۱۹۵۵ء سے ہی وابستہ ہو گیا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر میرے اکثر شاعر' ادیب' دانشور دوست آتے رہتے تھے۔ مگر قتیل شفائی نہ آنے کے برابر آتا تھا۔ ریڈیو پر مشاعرہ ہوتا تو اس سے تفصیل کے ساتھ ملاقات ہو جاتی وہ مشاعرہ پڑھنے کے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال لیتا تھا۔

جس مطربہ سے قتیل شفائی کا تعلق خاطر گہرا تھا اس نے شمع طرب کسی اور محفل میں سجائی تو شاعر قتیل شفائی نے اس کے ہرجائی پن اور لمحوں کی پرستش کے مسلک کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ معاملات عشق کے مدو جزر نے قتیل کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید صیقل کیا اور اس نے لمحوں کی پرستار کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو اس کے شعری مجموعے "مطربہ" میں شامل ہے۔ یہ نظم اس نے ایک مشاعرے میں پڑھی۔ مشاعرہ وائی ایم سی اے لاہور کے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ میرے تمام شاعر دوست قتیل سمیت موجود تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے عابد علی عابد صاحب مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے قتیل شفائی ویسے بھی شاعروں کا پسندیدہ شاعر تھا۔ شروع شروع میں وہ ترنم سے شعر پڑھتا تھا بعد میں اس نے تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا' عبدالحمید عدم' قیوم نظر' سجاد باقر رضوی' ناصر کاظمی اور انجم رومانی نے بھی اپنا کلام سنایا۔ قتیل شفائی نے جب اپنی نظم "لمحوں کی پرستار" پڑھنی شروع کی تو قتیل شفائی کے جو دوست اس کے معاملات عشق سے واقف تھے معنی خیز

نگاہوں سے قتیل کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سنجیدہ اور گہری آواز میں نظم پڑھ رہا تھا۔

میں نے چاہا تھا اسے روح کی راحت کے لئے
آج وہ جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
اب وہ چلتی ہوئی تلوار بنی بیٹھی ہے
ہم سفر بن کے جسے ناز تھا ہم راہی پر
رہزنوں کی وہ طرف راہ بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

میں اسے لے کے بہت دور نکل جاؤں مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
زندگی بھر کی پرستش اسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے
میں نے چاہا تھا اسے روح کی راحت کے لئے
وہ مگر جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

قتیل شفائی کی نظم کو مشاعرے میں اس اعتبار سے بھی بہت پسند کیا گیا کہ یہ شاعر کی قلبی واردات معلوم ہوتی تھی۔ قتیل شفائی کے رمز آشنا دوستوں کو تو مطربہ کے حدود اربع کا علم تھا۔ انہوں نے نظم میں جاری و ساری شاعر کے شدت ملال کے احساس کو سراہا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو ادیبوں کی ایک ٹولی پاک ٹی ہاؤس کی طرف اور دوسری کافی ہاؤس کی طرف چل دی۔ قتیل شفائی کی فلمی مصروفیات اسے ریستورانوں

میں بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں کی اجازت نہیں دیتی تھیں وہ ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس جانے کی بجائے تانگہ میں بیٹھ کر فلم سٹوڈیو یا کسی فلم پروڈکشن کے دفتر کی طرف چلا گیا۔

اس سے اگلے روز مری قتیل سے فلم سٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس کی نظم کی تعریف کی۔ کہنے لگا۔

میں نے ایک روز پہلے یہ نظم لکھی تھی

مطربہ کے بارے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ قتیل شفائی معاملات عشق میں راز داری کا قائل ہے عشق بے پردہ میں بھی وہ دو چار پردے ضرور گرائے رکھتا ہے۔ شاید یہ اس کے مشرقی مزاج کا اثر ہے یا شاید اسے اپنی محبت کی حرمت کا خیال رہتا ہے۔ کچھ بھی ہو یہ جذبہ میرے خیال میں قابل تعریف ہے اور میں نے کبھی اس کے عشق و عاشقی کے معاملات کو کرید کرید کر نہیں پوچھا۔ قتیل شفائی اپنی شاعری میں بھی سچا ہے اور عام زندگی میں بھی سچ بولتا ہے۔ سچی بات کہتے ہوئے وہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی کی بات اگر اسے ناگوار گزرتی ہے تو اس شخص کے منہ پر کہہ دیتا ہے کہ وہ آئندہ اس کے آگے ایسی بات نہ کہے۔ سچی بات منہ پر کہنے میں اسے دوسرے کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ دوستوں کے ساتھ ایثار کرتا ہے۔ انہیں مدد کی ضرورت ہو تو جتنی مدد کر سکتا ہے اتنی مدد ضرور کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میں صرف اتنی مدد ہی کر سکتا ہوں اس سے آگے مدد کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کے گھر میں مہمانوں کے لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ موجود رہتا ہے مہمان نوازی قتیل شفائی کے مزاج میں شامل ہے۔ کھانے اور پینے میں اس نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مہمان کو جس چیز کی طلب ہو اسے مل جاتی ہے دوسرے ممالک سے بھی قتیل شفائی کے ہاں مہمان بال بچوں سمیت اکثر آتے رہتے ہیں اور قتیل کے گھر میں

سداورت لگا رہتا ہے۔

مجھے کھانے پینے کا اتنا شوق نہیں ہے لیکن میں جب بھی قتیل شفائی کے گھر گیا اس نے اپنی روایت اور وضع داری کے مطابق میرے سامنے گھر میں موجود ہر شے لا کر رکھ دی۔ میں ایسے کئی دوستوں کو جانتا ہوں جن کا قتیل شفائی کے ساتھ اتنا تعلق خاطر نہیں ہے لیکن وہ اپنا کوئی نہ کوئی پسندیدہ مشروب نوش جاں کرنے کے لئے سرشام اس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں اور قتیل ان کی حتی المقدور مہمان نوازی کرتا ہے اور یقین کریں کہ قتیل شفائی کے ماتھے پر ذرا سا بھی بل نہیں پڑتا۔ قتیل کی اس کشادہ ظرفی پر مجھے بھی رشک آتا ہے۔ قتیل شفائی میں یہ خوبیاں خداداد ہیں جس طرح اس کا شاعرانہ جوہر خداداد ہے۔ ابتدا ہی سے اس کے چاہنے والے اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے ان میں کچھ ایسے تھے جو اس کی شاعری سے پیار کرتے تھے اور اپنے پسندیدہ شاعر کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو اس کی مدد سے شعر و فن کی دنیا میں اور قلم کے میدان میں اپنی قسمت آزمانے کی آرزو رکھتے تھے۔ قتیل شفائی ان کی مدد کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ ان کی جتنی مدد کر سکتا تھا کرتا اور انہیں ایسے موقعے فراہم کرتا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو آزما سکیں۔

قتیل شفائی کفایت شعار ضرور ہے مگر کنجوس ہرگز نہیں ہے۔ دوست احباب کی دعوتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ اپنے قریبی دوستوں کی محفل میں بھی وہ شعر سنانے سے گریز کرتا ہے۔ کوئی بہت اصرار کرے تو ایک آدھ غزل پڑھ دیتا ہے۔ ہمیشہ سے خوش لباس اور خوش خوراک رہا ہے۔ پہلے وہ سوٹ اور قمیض پتلون پہنا کرتا تھا۔ ایک عرصہ ہوا اس نے یہ پہناوا ترک کر دیا ہے اب وہ کرتہ پاجامہ اور شلوار قمیض میں ہی نظر آتا ہے دوستیاں نبھانے میں بھی اس کی وضع داری قابل داد ہے۔ قابل داد میں نے اس لئے کہا کہ یہ کام بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہے جس کو پہلے

روز جی کہا اس کو ابھی تک جی کہتا ہے اوئے کبھی نہیں کہا۔ دوستی نبھانے میں اس کا ظرف بڑا گہرا ہے۔ پچھلے دنوں میں زیر تحریر کتاب کے بارے میں ہی کچھ ضروری باتیں پوچھنے اس کے گھر گیا تو وہاں سعید شاہد سے ملاقات ہو گئی میرا خیال ہے میں نے اسے پینتالیس سال کے بعد دیکھا۔ وہ اس زمانے میں قتیل شفائی کا دوست تھا جب قتیل ہفت روزہ "اداکار" کا ایڈیٹر تھا قتیل شفائی کی سعید شاہد سے محبت اور دوستی روز اول کی طرح قائم تھی۔ دوست اپنے آپ بچھڑ جائیں تو بچھڑ جائیں۔ قتیل شفائی نے کبھی کسی دوست سے بے رخی نہیں کی۔ محترم احمد ندیم قاسمی سے قتیل شفائی کو شروع ہی سے محبت اور نیاز حاصل رہا ہے یہ محبت اور نیاز مندی آج بھی بدستور موجود ہے۔ اس نے قاسمی صاحب کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا ہے۔

قمر اجنالوی میرا اور قتیل شفائی کا مشترکہ دوست تھا۔ہم ۱۹۴۷ء سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ قمر اجنالوی ہفت روز "اداکار" میں قتیل شفائی کے ساتھ ہی پرچے کے ادارتی عملے میں شامل تھا۔ ہمارے ساتھ اس کا ملنا ملانا اس وقت سے چلا آرہا تھا۔ قمر اجنالوی کو بھی قتیل شفائی سے بڑی عقیدت اور محبت تھی وہ اسے بجا طور پر اپنا غم گسار سمجھتا تھا۔ ایک مدت گذر گئی تھی مگر قمر اجنالوی جب بھی کبھی میرے گھر کے قریب سے گزرتا تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی مگر مجھ سے ملنے ضرور آجاتا تھا۔ عمر کے آخری دنوں میں جب وہ بیمار پڑ گیا اور زیادہ چل پھر نہیں سکتا تھا تو ہفتے میں ایک بار اپنے بیٹے کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر میرے مکان پر آجاتا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ میرے پاس بیٹھتا۔ ہم نئے اور پرانے دنوں کی باتیں کرتے کچھ گزرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے خوش ہوتے۔ کچھ بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتے میرے مکان سے اٹھ کر یا میرے ہاں آنے سے پہلے وہ قتیل کے گھر ضرور جاتا۔ اس نے اپنے گھر فون نہیں لگوایا ہوا تھا کہا کرتا تھا کہ فون مجھے پریشان کرتا ہے۔ ان دنوں

قمر اجنالوی روز نامہ "مغربی پاکستان" کا ایڈیٹر تھا۔ ایک روز اس کی حالت اچانک خراب ہو گئی اس نے اپنے بیٹے کو کہا قتیل اور اے حمید کو جا کر بلا لاؤ۔ اس کا بیٹا سکوٹر پر فورا قتیل شفائی کے گھر گیا اور جا کر اپنے والد کی حالت بیان کی۔ قتیل شفائی اس وقت اپنے کام کے سلسلے میں بہت مصروف تھا کچھ لوگ نئی فلم کا معاہدہ کرنے اس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ اس نے قمر اجنالوی کی بیماری کا سنا تو فورا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بیٹے نوید قتیل سے کہا۔ "گاڑی نکالو"۔

قمر اجنالوی کا بیٹا اس کے بعد میرے گھر پہنچا اور اپنے والد کی علالت کا بتایا۔ میں اس کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر قمر اجنالوی کے مکان پر آگیا۔ قتیل شفائی مجھ سے پہلے قمر اجنالوی کے مکان پر موجود تھا۔ ہم نے اس وقت قمر اجنالوی کو گاڑی میں لٹایا اور ہسپتال لے گئے۔ قمر اجنالوی نیم بے ہوش تھا۔ اسے فورا طبی امداد پہنچائی گئی۔ جب تک اسے پوری طرح سے ہوش نہیں آگیا اور ڈاکٹروں نے یہ نہیں کہا کہ قمر اجنالوی کی حالت خطرے سے باہر ہے قتیل شفائی وہیں بیٹھا رہا اور قمر اجنالوی کو حوصلہ دیتا رہا کہ فکر نہ کرو تم بڑی جلدی اچھے ہو جاؤ گے قمر اجنالوی کا دو روز بعد ایک آپریشن ہوا وہ ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا۔ میں تو قمر اجنالوی کی خبر لینے صرف ایک بار ہی گیا لیکن قمر اجنالوی نے بعد میں بتایا کہ قتیل شفائی روزانہ شام کو اس کا حال پوچھنے آتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں کون ایسا کرتا ہے میں نے ایسا نہیں کیا جو قمر اجنالوی کا اتنا دوست تھا یہ قتیل شفائی کے کردار کی بلندی ہے کہ وہ اپنے ہمدم دیرینہ کی مزاج پرسی کے لئے روزانہ ہسپتال جاتا تھا۔ جب قمر اجنالوی صحت یاب ہو کر گھر آگیا تو میں اس سے ملنے گیا میں نے پوچھا۔

اب کیسے ہو؟

تم لوگ وقت پر نہ آتے تو میرا بچنا مشکل تھا۔

میں نے کہا۔ سارا کریڈٹ قتیل شفائی کو جاتا ہے وہی سب سے پہلے گاڑی لے کر تمارے پاس پہنچا اور اسی نے گاڑی میں ڈال کر تجھے ہسپتال پہنچایا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ جب میری حالت خراب ہونے لگی تو میں سمجھ گیا کہ وقت آخر آن پہنچا ہے۔ بس اس وقت سب سے پہلے مجھے قتیل شفائی کا خیال آیا۔ پھر تمہارا خیال آیا۔

قتیل شفائی کے گھر میں ایک کمرہ سب سے الگ ہے جو بطور مہمان خانے کے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ قتیل شفائی کے ہاں مہمانوں کی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ ایک بار میں اس کے ہاں گیا تو چھ سات مہمان مع بال بچوں کے ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے قتیل سے کہا۔

مجھے لگتا ہے میں سرائے عالمگیر میں آگیا ہوں۔

مہمانوں کی میزبانی کر کے وہ بڑا خوش ہوتا ہے کوئی مہمان دوبئی سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آیا ہے کوئی کینیڈا سے' کوئی لندن سے' کوئی بمبئی سے۔ مدراس سے آرہا ہے۔ ایک سداورت ہے جو قتیل شفائی کے ہاں لگا رہتا ہے میں نے کبھی اکتاہٹ یا بیزاری کے اثرات اس کے چہرے پر نہیں دیکھے۔ قدرت نے اسے معاشی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی کشادہ ظرفی اور خوش حالی عطا کر رکھی ہے۔ شام کے وقت دوست احباب کی محفل لگ جاتی ہے۔ چائے اور کافی پی جاتی ہے اور علم و ادب شعر اور شاعری پر باتیں ہوتی ہیں یہ زندہ دلی اور زندہ خیالی کی علامت ہے جس زمانے میں یونان کے خوشنما سبزہ زاروں میں سرشام شاعر' ادیب' شاعر اور فلسفی کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر سائپرس کے درختوں والی روشوں پر ٹہلتے ہوئے علم و ادب اور شعر و فلسفہ کی باتیں کیا کرتے تھے اس زمانے میں یونان علم و حکمت اور شعر و ادب کے عروج پر تھا لاہور علم و دانش شعر و ادب کا ہمیشہ سے گہوارہ رہا ہے۔ اس شہر کی ہمیشہ یہ روایت رہی ہے کہ یہاں ایسی محفلیں تسلسل کے ساتھ لگتی رہی ہیں جہاں علم و

ادب شعر و فلسفہ اور فن ادب پر گفتگو ہوتی تھی۔ جب تک اردو ادب کے اساتذہ کرام جیسے ڈاکٹر سید عبداللہ، حکیم احمد شجاع پاشا، عاشق حسین بٹالوی، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، نشتر جالندھری، پروفیسر سراج، ڈاکٹر نذیر احمد، فیض احمد فیض، اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم حیات رہے انہوں نے علم و ادب پر بحث و تمحیص کی شمعیں روشن کیئے رکھیں۔ ان شمعوں کی روشنی کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس اور نگینہ بیکری سے نکل کر شہر لاہور اور پھر سارے پاکستان کو اپنی روشنی عطا کرتی تھی ان کے چلے جانے کے بعد شمعیں ضرور روشن ہیں لیکن وہ گمنامی کی حالت میں روشن ہیں اور ان کی روشنی کہیں کہیں کسی کسی مکان کی چار دیواری تک ہی محدود ہے۔ قتیل شفائی اس روایت کو کسی نہ کسی حد تک زندہ رکھے ہوئے ہے یہ بھی اس کی وفاداری بشرط استواری اور وضع داری ہے۔ تھوڑی بہت شاعرانہ تعلی تو ہر شاعر میں ہوتی ہے لیکن اس کا ایک خاص حد سے آگے بڑھ جانا شاعر کی شاعری اور اس کی شخصیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ میرے اپنے دوستوں میں سے بعض شاعر ایسے ہیں جن کی تعلی نخوت و تکبر کی حد سے بھی آگے نکل چکی ہے وہ اپنے برابر کسی کو بھی نہیں سمجھتے۔ دوسرا شاعر خواہ ان سے بڑا شاعر ہی کیوں نہ ہو وہ اس کا ذکر اس طرح نخوت سے کرتے ہیں جیسے وہ کوئی نو آموز اور بے وقعت شاعر ہے۔ یہ بات قتیل شفائی کی طبع اور اسی کے مزاج ہی کے خلاف ہے۔ اس کے ہاں تو شاعرانہ تعلی بھی نہ ہونے کے برابر ہے اپنے کلام کے انتخابی مجموعے میں اس کا کہنا ہے۔

"حضرت احمد ندیم قاسمی، محترم خواجہ ذکریا اور برادرم شہزاد احمد کا میں تہہ دل سے ممنوں ہوں کہ انہوں نے میری گزارش پر میرے تمام شعری مجموعے سامنے رکھ کر مجھے وہ راہنمائی مہیا کی کہ میرے لئے زیر نظر انتخاب کا ترتیب دینا آسان ہو گیا۔

ہریالی' گجر' جلترنگ' روزن' جھومر' مطربہ' گفتگو' چھتنار' پیراہن' آموختہ' ابابیل' گھنگھرو' برگد اور سمندر میں سیڑھی' علیٰ الترتیب گذشتہ پینتالیس برسوں میں شائع ہونے والے میرے چودہ شعری مجموعے ہیں جن میں سے یہ انتخاب عمل میں آیا ہے۔ مجھے اپنے چند ابتدائی مجموعوں کے بارے میں بار بار سوچنا پڑا کہ آج سے بہت پہلے کیاگیا کچا پکا معصوم سا کلام اس انتخاب میں شامل کروں یا نہ کروں۔ جب اس سلسلے میں احباب سے رجوع کیا تو انہوں نے اس بے قصور کلام کو "شہر بدر" نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اپنے مشورے کے جواز میں انہوں نے اقبال کے اس کلام کا حوالہ دیا جو انہوں نے اکبر الہ آبادی کی پیروی میں کہا تھا۔ لیکن اپنی انفرادیت کے عروج پر پہنچنے کے باجود انہوں نے اسے اپنے دوسرے کلام سے الگ کرنا پسند نہ فرمایا۔ چنانچہ احباب کے اس مشورے کے بعد میں نے سوچا اگر اقبال جیسا عظیم الرتبت شاعر اپنی ابتداء کو خود سے نہ جدا کر سکا تو میرا کیا ہے؟ میں تو بس "پل دو پل کا شاعر ہوں"۔

قتیل شفائی کے مزاج میں ایک سنجیدہ پن اور دھیما پن ہے۔ وہ بحث بھی کرتا ہے۔ اپنے موقف کے حق میں دلائل بھی بڑے زور شور سے پیش کرتا ہے۔ اپنے جائز حقوق کی حمایت میں آواز بھی بلند کرتا ہے۔ لیکن کسی جگہ کسی مقام پر بھی اس کی آواز' آواز کا ساؤنڈ بیریر عبور نہیں کرتی۔ وہ ہر مقام پر اعتدال کے اندر رہتا ہے۔

پرانی یادوں کا ایک اور دریچہ کھولتا ہوں تو مجھے لاہور میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک کا علاقہ نظر آتا ہے۔ خاموش خاموش' پر سکون یہ اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا یہاں تین متروکہ ہوٹل تھے ایک کا نام برسٹل تھا' دوسرے کا نام ویسٹ اینڈ تھا اور تیسرے ریستوران کا نام کنگ سرکل تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے لاہور میں پنچولی فلم کمپنی اور شوری آرٹ پکچرز والوں کی فلمی سرگرمیاں جاری و ساری تھیں ان کمپنیوں کے مالکان اور کارپردازان ہندو تھے۔ متذکرہ بالا تینوں ہوٹلوں میں فلم آرٹسٹ موسیقار

اور فلمی شاعر وغیرہ بیٹھا کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو ان میں سے بیشتر ہندوستان چلے گئے جب ہم لاہور آئے تو برسٹل اور ویسٹ اینڈ ہوٹلوں میں صرف چند ایک فلم آرٹسٹوں کو دیکھا جن میں ایم اسماعیل اور اجمل نمایاں تھے جن فلمی فنکاروں بلکہ فلم کے شوقین نوجوانوں کو آگے چل کر پاکستان فلم انڈسٹری میں ہیرو بن کر مشہور ہونا تھا وہ اس وقت ان ہوٹلوں میں کسی کونے میں بیٹھ کر بڑے آرٹسٹوں کو قابل رشک نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ پاکستانی فلمی صنعت جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ان ہوٹلوں کی رونق میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ رائل پارک کا علاقہ پاکستان کی فلمی صنعت کا ہالی وڈ کہلانے لگا ان ریستورانوں میں ابتداء میں ایسے شاعر اور ادیب بھی آکر بیٹھتے تھے۔ جن کا فلم انڈسٹری سے اس وقت کوئی تعلق نہیں تھا ان میں حمید اختر' عبداللہ ملک اور ابن انشاء بھی شامل تھے۔ یہاں ہم لوگ اس لئے آکر بیٹھ جاتے تھے کہ یہ تینوں ہوٹل ایک تو "امروز" اخبار کے دفتر کے قریب تھے۔ دوسرا ان کی چائے بڑی اچھی ہوتی تھی۔ بعد میں جب "سویرا" کا دفتر لکشمی چوک میں گیتا بھون والی بلڈنگ میں "پیراڈائز ریسٹورنٹ" کے نام سے ایک نیا ریستوران کھل گیا چنانچہ پھر تقریباً سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اسی ہوٹل میں آکر بیٹھتے۔ چائے پیتے اور خوب بحث مباحثے کرتے۔

قتیل شفائی بھی کبھی کبھی یہاں آجاتا تھا۔ پیرا ڈائیز ریستوران میں ایک تو شاعر' ادیب ہوتے تھے پھر ان سے ملنے والے اور ان کے مداحین بھی آتے تھے اس وجہ سے یہ ریستوران کافی چل نکلا تھا اس کا مالک بڑا خوش تھا مگر اس کی ایک عجیب عادت تھی۔ ہم لوگ اکثر نقد چائے وغیرہ پیتے تھے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بل دوسرے یا تیسرے روز ادا کرتے۔ ریستوران کے مالک نے دروازے کے پاس ایک بلیک بورڈ لگایا ہوا تھا جو شاعر یا ادیب اتفاق سے وقت پر بل ادا نہیں کرتا تھا وہ اس کا نام بلیک

بورڈ پر لکھ کر آگے لکھ دیتا کہ ان کے ذمے اتنی رقم واجب الادا ہے۔ ریستوران کا مالک ادب سے تو تھوڑا بہت لگاؤ رکھتا تھا مگر وہ ادیبوں کے مزاج اور ان کے حالات سے واقف نہیں تھا ہم سب ادیبوں کی ہوائی آمدنی تھی کبھی کسی غزل مضمون یا افسانے کا معاوضہ اسی وقت مل جاتا تھا اور کبھی پبلشر وعدہ فردا پر ٹال دیتا تھا۔ چنانچہ کسی وقت ہم ادھار بھی کر لیتے تھے۔ لیکن ریستوران کے مالک نے جب بلیک بورڈ پر نام لکھنے شروع کر دیے تو ہم نے سخت احتجاج کیا۔ ریستوران کے مالک نے بلیک بورڈ اتروا دیا لیکن اب وہاں سے ہمارا دل اکھڑ گیا تھا چنانچہ پیراڈائیز ریستوران آہستہ آہستہ ادیبوں' شاعروں سے خالی ہوتا گیا۔ اب ریستوران کے مالک کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شاعر' ادیب' بڑے نازک احساس والے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ ریستوران بند ہو گیا۔ ہمارا کریڈٹ پاک ٹی ہاؤس میں بھی چلتا تھا جہاں ہم کتاب یا اپنے کسی مضمون یا افسانے کا معاوضہ ملتے ہی سارے بل ادا کر دیتے تھے۔

لیکن قتیل شفائی نے کبھی کسی ریستوران میں ادھار نہیں کیا تھا ایک تو یہ بات اس کے مزاج کے خلاف تھی دوسرے فلمی دنیا سے وابستگی کی وجہ سے وہ ہم سب میں سے خوش حال تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ریستورانوں میں بیٹھ کر شعر و ادب پر بحثیں کرے۔ قدرت نے اسے جو شاعرانہ صلاحیتیں عطا کر رکھی تھیں۔ وہ ان پر مزید محنت کرتا اور انہیں مزید آگے بڑھانے کی کوشش کرتا تھا جو ایک بڑی خوش آئند بات تھی۔ اس نے ادب اور فلم میں شعر کے ادبی معیار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہی دنوں لاہور میں ایک ہی موضوع پر دو فلموں کی تیاری کی دوڑ لگ گئی۔ موضوع لیلیٰ مجنوں کی محبت کا قصہ تھا۔ ایک سٹوڈیو میں یہ کہانی لیلیٰ مجنوں کے نام سے بن رہی تھی اور دوسرے سٹوڈیو میں عشق لیلیٰ کے نام سے تیار ہو رہی

تھی۔ ہر پروڈیوسر اسے جلدی سے جلدی مکمل کر کے پہلے ریلیز کرنا چاہتا تھا۔ قتیل شفائی عشق لیلیٰ کے گانے لکھ رہا تھا یہ ایک ریکارڈ ہے کہ اس نے اس فلم کے پندرہ کے قریب گانے دو یا تین دن میں لکھ ڈالے تھے اور کمال کی بات یہ ہے کہ ہر گیت ادبی اعتبار سے بھی خوبصورت اور مکمل تھا۔ چنانچہ قتیل شفائی کے لکھے ہوئے گانوں والی فلم باکس آفس پر کامیاب ہو گئی اور اس کے سارے کے سارے گیت بہت مشہور ہوئے۔ یہ کامیابی قتیل شفائی کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ بھی تھا۔وہ بہت محنتی ہے۔ ادبی تخلیق میں بھی اسے اپنی شاعری کے جمال کی آرائیش کرنی پڑتی ہے۔ نوک پلک سنوارنی پڑتی ہے۔ یہ کام بھی یک سوئی اور محنت طلب ہوتا ہے۔ لیکن اس میں زیادہ حصہ ایک خاص شاعرانہ کیفیت کا ہوتا ہے۔ شاعر پر کسی خاص موضوع کی پابندی نہیں ہوتی جبکہ فلم کے لئے کی جانے والی شاعری میں شاعر کو کسی مخصوص سچوایشن کا پابند کر دیا جاتا ہے اور اسے اس خاص موضوع یا سچوایشن کے اندر رہ کر گیت یا غزل تخلیق کرنی ہوتی ہے۔ خالص کمرشل کام ہوتا ہے یوں سمجھ لیں کہ شاعر کو ایک پتھر دے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں سے ہیرا تراش کر نکالیں پتھر میں سے ہیرا نکالنا ہر کسی فلمی شاعر کا کام نہیں ہے۔ لیکن قتیل شفائی نے قریب قریب ہر پتھر کو تراش کر اس میں سے ہیرا نکالا ہے اور اس کے بیشتر فلمی گیت اور غزلیں ایسی ہوتی ہیں جو بڑی آسانی سے ادبی رسالوں میں چھپ سکتی ہیں۔ مگر قتیل نے کبھی انہیں کسی ادبی پرچے میں نہیں چھپوایا۔

یہاں میں اس کے ایک غزل کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اس نے ایک فلم کی سچوایشن پر لکھی تھی۔

الفت کی نئی منزل کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں
کیا کیا نہ جفائیں دل پہ سہیں پر تم سے کوئی شکوہ نہ کیا
اس جرم کو بھی شامل کر لو میرے معصوم گناہوں میں

قتیل شفائی ان دنوں زندگی کی اس منزل میں ہے جہاں پہنچ کر آدمی عام طور پر آرام کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن قتیل شفائی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے اس کا شاعرانہ تخیل اور تخلیقی دار داتیں اور صلاحیتیں بدستور توانا ہیں وہ آج بھی عہد شباب والے احساس جمال کے ساتھ شاعری کر رہا ہے ادبی شاعری بھی کرتا ہے اور اپنی فلمی شاعری کو ابدی رتبے تک پہنچانے کے واسطے سخت جانی سے محنت بھی کرتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے میں اس سے ملاقات کرنے گیا تو وہ اپنے سادہ سے کمرے میں بیٹھا ادبی کام کر رہا تھا۔ کہن سالی کے اثرات ضرور تھے مگر مجھے اس کے چہرے میں سے چالیس پینتالیس سال پہلے کے قتیل شفائی کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ قوی میں اضمحلال نمودار ہونا ایک قدرتی امر ہے لیکن قتیل کے عناصر میں بے اعتدالی نہیں آئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کام چھوڑ دیا اور مجھ سے پوچھا۔

کیا پیئو گے۔

میں نے کہا صرف چائے پیوں گا۔

ہم باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ چائے میں پرانی یادوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ گزرے ہوئے خوبصورت ایام کی تصویریں میری آنکھوں میں لہرانے لگیں میرا دل چاہا کہ میں قتیل سے اپنی پسند کے کچھ شعر سنوں۔ میں نے اسے ایک غزل یاد دلائی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دو تین شعر سنا دیتا ہوں۔

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ
سکوت مرگ طاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

کسے جاتے ہو رو رو کر ہمارا حال دنیا سے
یہ کیسی راز داری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آجائے گی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

عہد رفتہ کا اک روزن جیسے وا ہوا اور بیتے دنوں کے پیراہن صد چاک میں سے بھولی بسری یادوں کے رنگ' خوشبوئیں اور روشنیاں طلوع ہونے لگیں۔ سرسبز و شاداب وادیوں کی ہریالی میں ہم نے اپنی دوستی کا سفر شروع کیا تھا ہمارے گرد و پیش چشموں کی جلترنگ تھی وقت کی مطربہ اپنے ماتھے پر چاند کا جھومر سجائے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ جو حسین و جمیل منظر ہماری جاگتی آنکھوں کے سامنے ہیں وہ ایک دن خواب ہو جائیں گے۔ یا شاید کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آئیں گے ہم اپنے ان ساتھیوں کی باتیں کرتے رہے جو دوستی کے سفر میں ہمارے ساتھ چلے تھے۔ لیکن راستے میں اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ کر ہم سے بچھڑتے گئے۔ جو کچھ مجھے یاد نہیں رہا تھا وہ قتیل شفائی نے یاد دلایا۔ جو اسے یاد نہیں تھا اس کا میں نے ذکر کیا کسی وقت یوں لگتا جیسے کچھ نہیں بدلا۔ ہر چیز ویسے کی ویسی ہے۔ ہم کل ہی ایک دوسرے سے ملے تھے۔ کبھی لگتا کہ جیسے ہزاروں برس بیت گئے ہیں وقت نے گزرے ہوئے حسین لمحوں کی یادگاریں بنا دی ہیں اور ہم ماضی کے اہرام میں سے عہد رفتہ کے نوادرات نکال رہے ہیں۔ ہم کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

پھر میں اٹھ کر چلا آیا۔ شعر و ادب کی دنیا میں قتیل شفائی کی تخلیقات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس نے کچی لگن' شب و روز کی محنت اور اپنے جوہر قابل سے بڑا نام پیدا کیا ہے اور دنیا نے اسے عزت و محبت دی ہے۔ اس نے امریکہ' کینیڈا' روس' برطانیہ' ہالینڈ' ناروے' فرانس اور متحدہ عرب امارات میں پاکستان کی ادبی نمائندگی کی ہے۔ اس کے کلام کا ترجمہ انگریزی' روسی' چینی اور گجراتی زبانوں میں چھپا ہے۔ اب تک وہ تقریباً ڈھائی ہزار فلمی نغمے لکھ چکا ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے اسے نیشنل فلم ایوارڈ اور دوسرے اداروں کی طرف سے بیس ایوارڈز' طلائی تمغے مل چکے ہیں اس کی شاعری پر ریسرچ کی جا رہی ہے سن ۱۹۹۴ء میں اسے حکومت پاکستان نے اس کی ادبی خدمات کے صلے میں تمغہ حسن کارکردگی بھی دیا۔ عالمی اردو کانفرنس کی جانب سے اسے امیر خسرو ایوارڈ' نقوش ایوارڈ اور شعری مجموعے "مطربہ" پر آدم جی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

○

ہو جاتے ہیں ناراض یہاں عقل کے اندھے
آئینہ قتیلؔ ان کو نہ تحفے میں دیا کر

قتیل شفائی کی شاعری

غزل

قتیل شفائی کا کہنا ہے کہ وہ کچھ شاعروں کے رنگ تغزل سے متاثر ضرور ہوا ہے لیکن اس نے ان کے اثر کو اپنی شاعری پر طاری نہیں ہونے دیا۔ ابتداء میں وہ علامہ اقبال سے متاثر تھا پھر اختر شیرانی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مولانا ظفر علی خان کی شاعری کے ترنم اور آہنگ نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پھر عہد جدید کے شعراء میں سے راشد، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ "لیکن میں کسی کا رہن نہیں ہوا۔ میں ہر گلستان شعر میں سے گذرتا چلا گیا اور اپنے فن کے اظہار کے لئے اپنی الگ راہ نکالی۔ اپنے شعر کو اپنا لہجہ، اپنی زبان دی اور یوں شعر کے اظہار میں اپنی انفرادیت سے ایک مقام بنایا اور آج تک اس راہ پر چل رہا ہوں۔" قتیل شفائی کے بیان پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا اس کے بیان کو اس کی شاعری کے تناظر میں دیکھنا چاہتا ہوں سب سے پہلے قتیل شفائی کے رنگ تغزل پر بات ہو جائے۔ لیکن اس سے پہلے میرے خیال میں شعر کی ماہیت پر تھوڑی سے گفتگو ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ اساتذہ نے شعر کے امکانات اور اس کی

خوبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے جن نظریات کا اظہار کیا ہے ان کے مطابق شعر کا تعلق حیات انسانی کے ساتھ نہایت گہرا ہے۔ شعر انسان کی پوشیدہ قابلیتوں کو سنوارنے اور جمالیاتی جذبات کو ابھارنے کا اہم ذریعہ ہے اور شعر کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ ہم اس کی بدولت کائنات کے ظاہری حسن اور پوشیدہ روحانی مفہوم سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ان نظریات کی روشنی میں حقیقی شاعر اسے کہا جاتا۳ ہے جس میں ظاہری حسن اور روحانی مفہوم دونوں کو سمجھنے کی قابلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہو۔ حقیقی شاعر کو فطرت کی جانب سے شاعرانہ تخیل اور شدت احساس کا ایک عطیہ خاص عطا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ کائنات کے حسن اور اس کی روحانیت کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہمارے تخیل کو بھی مہمیز ملتی ہے اور ہم بھی کائنات کے اسرار و رموز کو شاعر کے ساتھ بے نقاب دیکھتے ہیں۔ اساتذہ فن شعر کے نزدیک شعر کی حقیقی عظمت حیات انسانی کے روز مرہ کے امور کے علاوہ وہ روح اور جذبوں کے اعلیٰ مقامات کے انکشاف میں ہے۔ اس لئے کہ شاعری زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور حیات ہی کے واسطے زندہ رہتی ہے۔

میتھیو آرنلڈ نے اس نظریئے کی تائید میں کہا ہے کہ شاعری کا اصل اصول' حیات کی ترجمانی ہے اور شاعر کی عظمت حیات انسانی کے اعلیٰ خیالات کو حسن کاری کے ساتھ پیش کرنے میں ہے۔ کسی خاص نکتہ نظر یا نظریے کو پیش نظر رکھ کر شعر کہنے سے ابلاغ تو ہو جاتا ہے مگر شاعری مفقود ہو جاتی ہے۔ پھر شعر وعظ بن جاتا ہے اور شاعر اور واعظ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ادبی کارنامے بھی سرانجام دیئے گئے ہیں لیکن اس کا زیادہ تر انحصار شاعر کے زور بیان اور قدرت اظہار پر رہا ہے۔ قتیل کی غزل پر بات کرنے سے پہلے جدید شاعری کے تاریخی سند کا تذکرہ ضروری ہے۔ الطاف حسین حالی کو جدید

شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ بھی نہیں ہے لیکن اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو ہمیں محمد حسین آزاد جدید شاعری کی بنا ڈالتے نظر آئیں گے۔ بقول عبدالقادر سروری۔ "جدید شاعری کی تحریک کو بروئے کار لانے میں محمد حسین آزاد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے تنزل کا احساس سب سے پہلے انہی کو پیدا ہوا۔ انہوں نے ہی قدیم امی اور تقلیدی شاعری کے خلاف سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی"

الطاف حسین حالی سے پہلے محمد حسین آزاد شعر میں قدرت کے مناظر کے حسن اور تخیل کی حسن کاری پیش کر چکے تھے۔ وہ اپنے گرد پیش کی حقیقتوں کو اپنے تخیل کے امتزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ مقصدی اور اخلاقی نکتہ نظر کی شاعری سے گریز کرتے ہیں اور یہی بات انہیں اردو کی جدید شاعری کے بانی کا رتبہ دیتی ہے۔ آزاد کے کلام میں جدیدیت کا رنگ اس لئے بھی گہرا ہے کہ حالی کے خلاف ان کے سامنے شعر کا کوئی اخلاقی مقصد نہیں ہے۔

حالی ہمیں جدیدیت کی تحریک میں سرگرم زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ حالی نے جدید شاعری کی ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور عہد قدیم کی شاعرانہ تراکیب کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نظم اور غزل کو ایک نئی جہت دی۔ حالی کی مساعی سے اردو شاعری کا ایک نیا مزاج بیدار ہوا اور زندگی کے سنگین حقائق شاعری کا موضوع بن گئے۔ آزاد اور حالی کے بعد اقبال نے اردو شاعری کے رنگ جدید کو ایک قابل رشک مقام تک پہنچا دیا۔ اقبال دور جدید کی اردو شاعری میں خیال کی رفعت اور فلسفیانہ بلند آہنگی کے موجد ہیں انہوں نے اردو غزل کو ندرت خیال کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی دی۔ حسرت موہانی نے غزل کو پھر سے عاشقانہ جذبے دیے اور اس میں ایک نئی روح پھونکی۔ حسرت نے غزل کے ذریعے عشقیہ تخیل میں ایک نئی جان ڈال

دی اور عہد جدید میں غزل کا احیا ممکن ہوا۔ آگے چل کر ہم فانی، اصغر گونڈوی جگر اور جوش کی غزلیات کو اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھتے ہیں جگر مراد آبادی نے اپنے اسالیب سے غزل میں محبت کے نئے رنگوں کی آمیزش کی۔

فراق گورکھپوری تک پہنچتے پہنچتے غزل نے عہد نو کے روز مرہ حقائق کی بھرپور ترجمانی شروع کر دی تھی اور غزل میں عشقیہ معاملات کے ساتھ عام آدمی کے حالات اور اس کی بے بسی کا اظہار بھی شروع ہو چکا تھا۔ اشتراکی نظریات کا بھی چرچا تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی۔ فراق کی شروع شروع کی شاعری میں ہمیں نظریاتی شاعری کی تقلید ملتی ہے لیکن بعد میں انہوں نے غزل میں معاملات عشق کو اپنا لیا اور اس روش پر آخر تک قائم رہے۔ نیاز فتح پوری فراق کی اسی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "فراق نے عشق و محبت کے والہانہ انداز کو جو غزل کی جان ہے کسی جگہ بھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا"

دوسری جنگ عظیم کے بعد بعض نئے سیاسی نظریات کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑا جن میں اشتراکی نظریہ سب سے نمایاں تھا۔ ترقی پسند تحریک کے پیچھے یہی نظریہ کسی قدر ہلکے انداز میں کارفرما تھا اس انقلابی رجحان کو ہم اس وقت کے یورپی ادیبوں میں نشو و نما پاتے دیکھتے ہیں یہ عہد جدید اردو شاعری میں شعر کے نئے تصورات اور فن شعر کی نئی جہتوں کی ابتدا کا دور ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے بارے ہر قسم کی خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے اپنا مفہوم واضح کر دیا۔ اس تحریک کے پس منظر میں ایک ہی نظریہ کھل کر سامنے آیا کہ شعر و ادب کو زندگی اور وقت کی تبدیل ہوتی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ اس تحریک کا

فوری اثر یہ ہوا کہ جس شاعری اور افسانوی ادب میں عشق و محبت کی داستانیں بیان ہو رہی تھیں ان میں زندگی کے تلخ حقائق کا رنگ بھی نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا۔ لیکن عشق و محبت کے جذبات انسان کی جبلت کا حصہ ہیں۔ جب آدمی کو روٹی مل جاتی ہے تو وہ محبت کی باتیں سوچنے لگتا ہے ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ مجاز، کیفی، جذبی ایسے ترقی پسند شاعروں کا چراغ زیادہ دیر تک نہ جل سکا اور ان کے بعد شاعروں کا ایک نیا گروہ سامنے آیا۔ جو زندگی کی تلخ حقائق سے بھی بیگانہ نہیں تھے لیکن عشقیہ مضامین کو شاعری کی جان بھی سمجھتے تھے۔

ان شاعروں کے گروہ میں قتیل شفائی کا نام نمایاں ہے قتیل شفائی کی غزل میں ہمیں محبوب سے بے وفائی اور زمانے کی ستم رانیوں کا شکوہ نہیں ملتا۔ وہ وفا اور زمانے کے ستم کو ایک نئے انداز سے محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب میں اس کی حقیقت پر طنزکرتا نظر آتا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں ہی قتیل شفائی کا یہ رجحان واضح ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ابتدائی دور کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیا نے ہم پہ جب کوئی الزام رکھ دیا
ہم نے مقابل اس کے ترا نام رکھ دیا

اک خاص حد پہ آگئی جب تیری بے رخی
نام اس کا ہم نے گردش ایام رکھ دیا

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی قتیل
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

قتیل کا انداز بیان اس کی تشبیہات اور رموز و کنائے اس کے خالص اپنے مزاج

کے پیدا کردہ ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے دیگر رومانوں' شاعروں سے متاثر ضرور ہوا مگر کسی بھی شاعر کے رنگ کو اس نے اختیار نہیں کیا۔ نہ عشقیہ مضامین کے انتخاب میں اور نہ بحروں کے انتخاب میں۔ جبکہ اس کے دوسرے ہم عصر رومانیت پسند شاعروں میں ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملتی۔ دوسرے شاعروں میں اگر کوئی میر تقی میر سے متاثر ہوا تو میر کا رنگ اس کی غزلوں اور بحروں میں بھی اتر گیا۔ قتیل شفائی کی شاعری تقلید کی فرسودہ روایت سے پاک ہے۔ اختر شیرانی کی رومانوی شاعری کو اس نے پسند ضرور کیا مگر اپنی شاعری پر اس کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ غزل کو اس نے اپنا لب و لہجہ دیا۔ وہ محبوب سے خالص اپنے منفرد انداز میں مخاطب ہوا۔ اس نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ غالب کی طرح قتیل شفائی نے اپنی شاعرانہ انا کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس کی غزل کے تین شعر یہاں پیش ہیں۔ یہ غزل اس کے شعری مجموعے "گفتگو" میں شامل ہے۔

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

بجھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند
کوئی دیا مری پلکوں پہ اب جلا نہ کرے

زمانہ دیکھ چکا ہے پرکھ چکا ہے اسے
قتیل جان سے جائے پہ التجا نہ کرے

قتیل کا لفظوں اور تراکیب کے استعمال اور انتخاب کے معاملے میں بھی اپنا الگ مذاق اور مزاج ہے۔ اس کی غزلوں کے الفاظ میں ہمیں ترنم کے ساتھ ایک خوش آہنگی بھی ملتی ہے اور معنوی وضاحت بھی قتیل شفائی نے اپنے پیار اور اپنے محبوب کو

رمز اور استعاروں کے پردے میں نہیں چھپایا بلکہ شاعرانہ اسلوب اور جذبات کی پوری شدت کے ساتھ قلبی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔

ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اک یہی عیب ہے اس شہر کے داناؤں میں

مجھ سے کرتے ہیں قتیل اس لئے کچھ لوگ حسد
کیوں مرے شعر ہیں مقبول حسیناؤں میں

اور

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

قتیل شفائی کی غزل میں رمزیت کا عنصر ضرور شامل ہے لیکن یہ رمزیت کی مجبوری نہیں بلکہ اس کے اظہار کا کمال ہے۔ کہ وہ بات کہہ بھی جاتا ہے اور بات کو ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا۔ یہی اس کی شاعرانہ مہارت کا ثبوت ہے۔ قتیل شفائی کی شاعری میں خاص طور پر اس کی غزلیات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے عہد کی پیداوار ہے۔ اس کی شاعری میں عشقیہ مضامین کے علاوہ اس کے عہد کے تمام مسائل کہیں واضح طور پر اور کہیں اشاروں کنایوں میں موجود ہیں۔ اس کے آس پاس جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جس قسم کی بھی سیاسی تحریکیں اور سماجی عدم اطمینان موجود ہے۔ قتیل شفائی کو اس کا گہرا شعور ہے اور وہ اپنی شاعری میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن کسی مقام پر بھی شاعرانہ حسن کاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

پکڑا ہی گیا ہوں تو مجھے دار پہ کھینچو
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

کس قوم کے دل میں نہیں جذبات براہیم
کس ملک پہ نمرود حکومت نہیں کرتا

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیروں میں عبادت نہیں کرتا

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

جس طرح شعر کا ایک اپنا مزاج اور کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں اسی طرح شاعر کا بھی ایک اپنا مزاج ہوتا ہے اور اس کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں شاعر کا مزاج جب شعر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جائے تو شعر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کا مسلک خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کا شعر قاری کے ذہن پر اثر ضرور پیدا کرتا ہے۔ جہاں شعر کے مزاج اور شاعر کے مزاج میں باہم اتحاد و اتفاق نہ ہو وہاں شعر کی تاثیر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے شاعر میں ہمیں فن کی پختگی تو مل سکتی ہے لیکن شعر کی نظامت اور نازک خیالی اور دل پر اثر کرنے والے جذبات ہرگز نہیں ملیں گے۔ خاص طور پر ایسا شاعر جب رومانی شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کرتا ہے تو اس کی کوشش ایسی ہی مضحکہ خیز ہوتی ہے جیسے کوئی ہاتھی اڑنے کی کوشش کرے۔

ایک شاعر وہ ہوتا ہے جسے قدرت کی طرف سے شاعری کی حس لطیف نہیں ملی ہوتی۔ اس کا قلب شاعرانہ تخیل اور شاعری کی لطافتوں اور نازک احساسات سے خالی

ہوتا ہے۔ وہ صرف عروض کا علم پڑھ کر شبانہ روز کی مشق سے شعر کہنے میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ جس طرح کوئی آدمی بڑی لگن اور استاد کی خدمت کر کے خراد کا کام سیکھ لیتا ہے اور لوہے کے ٹکڑے کو خراد کی مشین پر چڑھا کر جیسا چاہے پرزہ بنا لیتا ہے۔ وہ شاعری کے فن کا مستری ہوتا ہے۔ شعر اگر کسی جگہ سے جھول کھاتا ہو یا کسی شعر کو کان پڑ گئی ہو تو وہ اسے فوراً عروض کے شکنجے میں چڑھا کر درست کر دیتا ہے۔

ایک شاعر وہ ہوتا ہے جسے قدرت کی طرف سے شاعرانہ تخیل کاری اور حسن لطیف پورے طور پر ودیعت ہوتی ہے۔ قدرت نے اس کے مزاج میں شاعرانہ صلاحیتیں داخل کی ہوئی ہوتی ہیں لیکن اس شاعرانہ مزاج کا ہلکا سا پرتو بھی اسی کی اپنی شخصیت میں نظر نہیں آتا۔ مگر اسے دیکھ کر قاری یہ ضرور کہتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ شعر تم کہتے ہو اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ اس کے شاعرانہ تصورات اور محسوسات اور اس کی اپنی شخصیت میں مشرق اور مغرب کا فرق ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی شاعری کے اثرات سے محروم ہوتی ہے۔ ایسے شاعر شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور دنیا داری بھی بڑی اچھی کر لیتے ہیں۔ لیکن شعر کی لطافتیں زیادہ دیر تک ان کے پاس قیام نہیں کرتیں۔ ایک شاعر وہ ہوتا ہے جس کی شخصیت اس کی شاعری کا حصہ بن جاتی ہے وہ اگر شعر نہ بھی کہے تو شاعر لگتا ہے۔ شاعر ہوتا ہے۔ شعر کہے تو لگتا ہے اس کی پوری شخصیت پورا جسم کوئی بات کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی بات کیسی ہے۔ اچھی ہے بری ہے دلچسپ ہے یا غیر دلچسپ ہے۔ مگر اس کے شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ قدرت نے شعر کا' شاعری کا' شاعرانہ احساسات کا' اسے جو حسن عطا کیا ہوتا ہے وہ اس کی پوری شخصیت پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ جیسے شعر کہتا ہے ویسی ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں کو اگر بحر اور عروض میں ڈھال دیں

تو شعر بن جاتی ہیں۔ اس کے اشعار کی نثر بنا دیں تو وہ اس شخص کی باتیں بن جاتی ہیں۔ ایسا شاعر ضروری نہیں کہ ملٹن یا غالب ہو۔ وہ پستی اور بلندی سے بے نیاز ہوتا ہے قدرت نے اسے خود شعر کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ وہ صرف شاعر ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ شعر کہنے' قدرت کے حسن اور کائنات کے لطیف رموز کو محسوس کر کے انہیں شعر کی زبان میں ادا کرنے کے لئے اس قسم کے ہمہ تن اور ہمہ شخصیت شاعر کا وجود ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی خدا داد شاعرانہ صلاحیتوں اور استعداد سے پورا فائدہ نہ اٹھائے اور شعر و ادب اور متبادل علوم کے مطالعے کی کمی کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں زنگ آلود ہوتی چلی جائیں۔ کیونکہ قدرت جوہر قابل کا ہیرا ضرور عطا کرتی ہے۔ مگر یہ ہیرا وہ انگوٹھی میں جڑ کر نہیں دیتی۔ اس ہیرے کو پتھر میں سے نکال کر اسے تراش کر کشاکش نرم و گرم کے مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ ہیرا حاصل ہوتا ہے۔

ایسے شاعروں کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں۔ اردو شاعری کے قدیم اور جدید عہد میں ایسے شاعر ہوتے ضرور ہیں مگر وہ چند ایک ہی ہیں۔ مثال کے طور پر نظیر اکبر آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ آگے آپ خود اپنے قیاس سے کام لے لیں یہ بھی قدرت کی ایک ستم ظریفی ہی سمجھئے کہ ایسے ہمہ جہت ہمہ شخصیت شاعروں میں سے کوئی بھی غالب گوئٹے اور اقبال جیسا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ جس نے زمانے کی رو میں انقلاب پیدا کر دیا ہو۔ اگر ہم ایسے ہمہ صفت شاعروں کی مختصر سی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایسے شاعر جن کی پوری شخصیت شعر میں ڈوبی ہوئی ہو عام طور پر فقرو مستی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کو کائنات اور زندگی کے راز سمجھا سکیں یا نہ سمجھا سکیں مگر خود سمجھ جاتے ہیں اور دنیا اور علائق دنیاوی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ میری رائے میں شعر و ادب کا فن صرف وہیں اپنی چمک دمک

اور کلاسیکیت کے عروج پر ہوتا ہے جہاں اس کے سونے میں تھوڑا سا کھوٹ بھی ملا ہوا ہو۔ اس کے ثواب میں تھوڑی سی گناہ کی بھی آمیزش ہو۔ وہ کسی وقت جنت میں ہو تو کسی وقت اسے جہنم کے شعلوں کی تپش بھی محسوس ہو رہی ہو۔

یہ بھی بڑی غنیمت ہے کہ قتیل شفائی ایسے ہمہ جہت' ہمہ شخصیت شاعروں میں سے نہیں ہے۔ ورنہ وہ بھی ہمارے ہاتھ سے گیا تھا۔ اس کی شاعری میں جنت اور جہنم اس لئے موجود ہیں کہ اسے دونوں دنیاؤں کے وجود کا شدت سے احساس ہے۔ قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ اسے شاعرانہ صلاحیتوں کا عطیہ دیا ہے قتیل نے شاعرانہ احساسات اور نازک جذبوں کو صرف شعر کہنے کے لئے استعمال کیا ہے ان کا اثر اپنی شخصیت پر نہیں پڑنے دیا۔ اگر قدرت کے قوانین پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ قدرت کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ہے۔ مگر قتیل شفائی یہ بغاوت کر گیا ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ اس کا مزاج باغیانہ ہے اور اس کا مزاج بھی قدرت نے ہی بنایا ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں دنیاوی علائق سے ماورا کائنات کے روحانی اسرار' رموز کی فکر انگیزی اگرچہ نہیں ملتی مگر ان کے احساس کا ادراک ضرور ملتا ہے۔ اس نے دنیا کادامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ ضرورت سے زیادہ پکڑا ہوا ہے۔ یہ حقیقت اس کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ کوئی ایسا عیب بھی نہیں ہے کہ کسی خداداد صلاحیتوں والے شاعر کو اچھا شعر کہہ سکنے کی اہلیت سے محروم کر دے بلکہ دنیاوی جذبوں کی شکست وریخت اور اس کے ردعمل میں پیدا ہونے والے پچھتاوں اور ملال سے زندہ رہنے والی شاعری وجود میں آتی ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔

ذہنوں میں اس کا پورا سراپا بھی آئے گا
آتا ہے جو بکھر کے وہ یک جا بھی آئے گا

کمرہ ہی بند ہے تو ہواؤں کا کیا قصور
کھڑکی کوئی کھلے گی تو جھونکا بھی آئے گا

یہ ہجرتوں کی شب ہے گھروں سے نکل پڑو
اس کا کرم ہوا تو مدینہ بھی آئے گا۔

سورج کوئی قتیل افق سے ہو گر طلوع
یہ رات بھی کٹے گی، سویرا بھی آئے گا

(ابابیل)

قتیل کی شاعری میں مولانا ظفر علی خان کا اثر ان کی بعض مترنم بحروں تک ہی محدود رہا۔ درج ذیل غزل میں ہمیں بحر کا ترنم ظفر علی خان کے عہد کی شاعری کی یاد دلاتا ہے۔

اک جام کھنکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اک ہوش ربا انعام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

وہ دیکھ ستاروں کے موتی ہر آن بکھرتے جاتے ہیں
افلاک پہ ہے کہرام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

گو دیکھ چکا ہوں پہلے بھی نظارہ دریا نوشی کا
ایک اور صلائے عام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

یہ وقت نہیں ہے باتوں کا، پلکوں کے سائے کام میں لا
الہام کوئی الہام، کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

مدہوشی میں احساس کے اونچے زینے سے گر جانے دو
اس وقت نہ مجھ کو تھام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

الفاظ کے چناؤ اور لفظوں کی مشکل تراکیب میں قتیل نے مولانا ظفر علی خان کی تقلید سے اجتناب کیا ہے۔ اساتذہ کی صحبت میں وہ صرف پل دو پل کے لئے رکا ہے اور پھر اپنی الگ راہ بناتا ہوا آگے نکل گیا ہے۔ ہم اگر قتیل شفائی کی غزلوں، نظموں اور گیتوں کا جائزہ لیں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ وہ اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ اور نمایاں انفرادیت کا حامل ہے۔ اس نے غزل کے جدید رنگ کو نکھارا بھی ہے اور اسے ایک نیا لب و لہجہ بھی دیا ہے جو اس کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ اس کی غزل، اس کی نظم اور گیت قتیل شفائی کی اپنی زبان اور اپنے لب و لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے ہاں عشقیہ جذبات کا والہانہ پن بھی ہے اور معاملات عشق کے تجربوں کی گہرائی اور شگفتگی بھی۔ کتنی بڑی حقیقت کیوں نہ ہو۔ قتیل شفائی اسے اپنے مخصوص طرز بیان کے ساتھ بڑی سادگی اور فن کارانہ حسن کے ساتھ بیان کر جاتا ہے۔ غزل نگاری کے مضامین وہی ہیں جو دوسرے غزل گو شاعروں کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن قتیل کے کلام میں یہ مضامین اس کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قتیل شفائی کو موضوعات کی تلاش کے لئے اپنے سے پہلے کے شاعروں کی خوشہ چینی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ قتیل شفائی اپنے عہد کی پیداوار ہے اور شاعر اپنے عہد کی نقش گری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن قتیل پرانی نقش گری کے نقوش میں اضافہ کرنے کی بجائے اپنے تخیل اور فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے نئے نقش بناتا چلا گیا ہے۔ اس کی ایک غزل کے درج ذیل اشعار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہم کو تو انتظار سحر بھی قبول ہے
لیکن شب فراق ترا کیا اصول ہے

اے ماہ نیم شب تری رفتار کے نثار
یہ چاندنی نہیں، ترے قدموں کی دھول ہے

باقی ہے پو پھٹے بھی ستاروں کی روشنی
شاید مریض شب کی طبیعت ملول ہے

جب معتبر نہیں تھا مرا عشق بدگماں
اب حسن خود فروش کا رونا فضول ہے

لٹ کر سمجھ رہے ہیں کہ نادم ہے راہ زن
کتنی حسین اہل مروت کی بھول ہے

قتیل شفائی کی غزل میں ایک اچھوتا پن ہے۔ ایک بانکپن ہے۔ اس کا طرز ادا خوشنما ہے جو دل پر اثر کرتا ہے۔ اس سے زیادہ شاعر کو اور کیا چاہئے جبکہ اظہار خیال میں وہ منفرد بھی ہو۔ وہ کہتا ہے۔

میں اس کا دوست ہوں وہ اعتراف کرتا تھا
مگر وہ باتیں بھی میرے خلاف کرتا تھا

بنا ہوا ہے وہ چھوٹا سا ایک درباری
مزاج شاہ سے جو اختلاف کرتا تھا

کمال ہے کہ ہوا وہ بھی نذر بے خبری
جو ہم پہ روز نئے انکشاف کرتا تھا

وہ قتل ہو گیا بد صورتوں کی محفل میں
جو سارے شہر کے آئینے صاف کرتا تھا

جمالیاتی اعتبار سے بھی قتیل شفائی کی غزل کا اپنا ایک انفرادی مقام ہے۔ اس نے غزل کے بنیادی ضابطوں اور اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ بلکہ اپنے داخلی اور خارجی جذباتی تجربوں کے امتزاج سے غزل کی صنف میں اضافہ کیا ہے۔ اس وجہ سے بھی ہمیں قتیل کی غزل میں ایک نیا انداز ملتا ہے۔ مومن کی طرح قتیل شفائی کی غزل پہلو دار نہیں ہے اور نہ اس میں ابہام ہے۔ وہ اپنی واردات عشق کو تہہ داری کے ساتھ بھی پیش نہیں کرتا۔ اظہار کی بے ساختگی نے قتیل شفائی کی غزل کو وسیع' رنگین اور حسن کار بنا دیا ہے۔ قتیل شفائی کے ہاں غزل میں الفاظ کا استعمال مناسب اور برجستہ ہے اور اس کے لب و لہجے نے فن کو ایک نئی صورت عطا کر دی ہے۔ قتیل شفائی کی غزل اردو غزل کی روایت میں ایک حسین اضافہ ہے۔ اگرچہ قتیل شفائی کی شاعری کا موضوع اور مزاج زیادہ تر عشق و عاشقی ہی ہے لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قتیل شفائی نے اپنے عہد کے سیاسی حالات اور اجتماعی مسائل سے گریز نہیں کیا۔ اس کی غزلوں میں ہمیں اپنے عہد کے اجتماعی مسائل کا واضح عکس ملتا ہے۔

افق کے اس پار زندگی کے اداس لمحے گزار آؤں
اگر مرا ساتھ دے سکو تم تو موت کو بھی پکار آؤں

کچھ اس طرح جی رہا ہوں جیسے اٹھائے پھرتا ہوں لاش اپنی
جو تم ذرا سا بھی دو سہارا تو بار ہستی اتار آؤں

بدل گئے زندگی کے محور طواف دیر و حرم کہاں کا
تمہاری محفل اگر ہو باقی تو میں بھی پروانہ وار آؤں

کوئی تو ایسا مقام ہو گا' جہاں مجھے بھی سکوں ملے گا
زمیں کے تیور بدل رہے ہیں تو آسماں کو سنوار آؤں

قتیل اپنے زمانے کی تہذیبی شکست وریخت سے خود بھی متاثر ہے اور اس کی اس دور کی غزل میں بھی یہ تاثر نمایاں ہے۔ قتیل شفائی کی شاعری اگرچہ انسانی محسوسات اور جذباتی کیفیات کی شاعری ہے لیکن اس کے باوصف اس کی غزلوں میں واردات عشق کے شعور کا احساس بھی ملتا ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔

دیکھنے کو ہمیں وہ خواب ملے
سوچ کر بھی جنہیں ثواب ملے

اس طرح وہ ملا ہے یادوں میں
جیسے کھوئی ہوئی کتاب ملے

اس نے رکھا ہی تھا چمن میں قدم
منہ چھپائے ہوئے گلاب ملے

کس کا چہرہ قتیل پڑھتے ہم
لوگ اوڑھے ہوئے نقاب ملے

نظم

بعض غزل گو شعرا کی غزلیں پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے شاعرانہ خیالات کا اظہار نظم میں کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بعض نظم گو شاعر ایسے بھی ہیں کہ جن کی نظمیں پڑھتے وقت یہ خیال گزرتا ہے کہ شاعر نے اپنی غزلوں کو نظم کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ قتیل شفائی کی شاعری ان شائبوں سے مبرا ہے۔ اس کی غزل میں غزل ہی کا رنگ تغزل غالب ہے اور نظم لکھتے وقت اس نے نظم کا حق المقدور حق ادا کیا ہے۔ جس وقت قتیل شفائی نے نظم لکھنی شروع کی اس وقت اردو نظم اپنے رنگ جدید کے عروج پر تھی اور بڑے بڑے نامور شاعر رومانوی اور ترقی پسند، ترقی پسند رومانوی اور رومانوی ترقی پسند نظمیں لکھ رہے تھے۔ نظیر اکبر آبادی، آزاد، حالی اور عظمت اللہ خان کے بعد نظم نے ایسا باکمال زمانہ نہیں دیکھا تھا۔ کیا آزاد، کیا پابند، کیا معرا اور کیا غیر معرا۔ ہر میدان میں نظم کا سکہ چل رہا تھا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک کے شاعروں کا میدان کار زار نظم ہی کا میدان تھا۔ ترقی پسند شاعروں کی توجہ اپنے مخصوص نظریے کے ابلاغ کی طرف تھی انہیں نظم کے روائیتی ڈھانچے اور لگے بندھے ضابطوں میں رد و بدل کی فرصت ہی نہیں تھی۔ جبکہ نیم ترقی

پسند اور روائیتی نظم کہنے والے شاعر نظم کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کر رہے تھے۔ مختار صدیقی نے "راگ درباری" کے عنوان سے نظم لکھی جس میں اس راگ کے الاپ کو مصرعوں کی بتدریج بڑھت سے واضح کیا گیا تھا۔

روشنی تیز ہوئی شمعوں کی ایوانوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی ایوانوں کی
اور شب کی دلہن شرمائی

روشنی تیز ہوئی شمعوں کی ایوانوں کی
اور شب کی دلہن مسکائی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی ایوانوں کی
اور شب کی دلہن شرمائی، مسکائی

معرا نظموں کی شاعری میں ن م راشد کا کوئی ہم سر نظر نہیں آتا تھا۔ جوش جذبی، اختر الایمان، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، مجاز اور دوسری طرف یوسف ظفر، حفیظ جالندھری، میرا جی، قیوم نظر اور دوسرے کئی نامور نظم گو شاعر اپنی شہرت کے بام بلند پر تھے۔ یہ وہ ادبی ماحول تھا جس میں قتیل شفائی نے غزل کے علاوہ نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اس کی نظموں کے موضوع اپنے عہد کی حقیقتیں تھیں موضوع نئے نہیں تھے مگر قتیل شفائی کی نظموں کے نئے لب و لہجے اور آہنگ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اردو شاعری کا بیشتر حصہ چونکہ حسن و عشق کے مضامین پر ہی مشتمل ہے اس لئے عشقیہ مضامین قتیل شفائی نے اپنی غزلوں میں تو بہت باندھے ہیں مگر نظموں میں ہمیں اس کے عہد کے سنگین طبقاتی مسائل اور فکری رجحانات کی ترجمانی زیادہ ملتی ہے یہاں اس کی وہ انفرادیت جو اس کی غزلوں میں بھرپور طریقے سے نمایاں ہے

پس منظر میں دب گئی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے دور کی روایتی نظم سے متاثر ہو کر اسی انداز میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہے اس کے باوجود قتیل کے موضوعات میں تنوع موجود ہے اور ان میں جسمانیت کا ارضی پہلو جگہ جگہ ابھرتا ہے یہ وہ حقائق ہیں جو اس زمانے کے ماحول پر محیط تھے۔ اور کوئی بھی نظم کہنے والا شاعر ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ لیکن قتیل 'اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے۔ زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں' کے نظریے کا قائل نہیں ہے۔ وہ ہم رقص کو اس مقام پر اپنی جان کا آزار کہتا ہے۔

میں نے چاہا تھا اسے روح کی راحت کے لئے
آج وہ جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
ہم عصر بن کے جسے ناز تھا ہم راہی پر
رہزنوں کی وہ طرف دار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

میں اسے لے کے بہت دور نکل جاؤں مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
زندگی بھر کی پرستش اسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے

قتیل شفائی کی نظموں کی ممتاز ترین خصوصیت بھی اس کا احساس حسن اور عشق وعاشقی کے معمولات ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

تیرے خطوں کی خوشبو
ہاتھوں میں بس گئی ہے سانسوں میں رچ رہی ہے
خوابوں کی وسعتوں میں اک دھوم مچ رہی ہے
جذبات کے گلستاں مہکا رہی ہے ہر سو
تیرے خطوں کی خوشبو

تیرے خطوں کی مجھ پر کیا کیا عنائتیں ہیں
بے مدعا کرم ہے' بے جا شکائتیں ہیں
اپنے ہی قہقہوں پہ برسا رہی ہے آنسو
تیرے خطوں کی خوشبو

کیا جانے کس طرف کو چپکے سے مڑ چلی ہے
گلشن کے پر لگا کر صحرا کو اڑ چلی ہے
روکا ہزار میں نے آئی مگر نہ قابو
تیرے خطوں کی خوشبو

"مطربہ"

قتیل کی نظموں میں عشقیہ تصوریت کا عنصر بالکل نہیں ہے۔ وہ تجربوں کی بات کرتا ہے۔ عشق و محبت کی باتیں اور گھاتیں اس کی ذاتی قلبی واردات اور تجربات کا نتیجہ ہیں۔ قتیل کی نظموں کے ایسے مضامین میں ہمیں روایتی انداز نہیں ملتا۔ حادثات عشق کے رد عمل میں وہ احساس کی پوری شدت کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اس کے یہاں غزل والی پردہ داریاں اور تہہ داریاں نہیں ہیں۔

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

ابھرے ابھرے ہونٹ ہیں اس کے کھلتے سرخ گلاب
اس کی رنگت مستقبل کا دھندلا دھندلا خواب

اس کے نغموں کی لے پر بہتا ہے مست چناب
اس کی چال چکوروں جیسی اس کا بدن کم خواب

پیاس بھڑکتی ہے جب میری بن جاتی ہے جام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

مان لیا کچھ اور تھی پہلے اس کے پیار کی ریت
ایک ہی سر پر کبھی نہ قائم تھا اس کا سنگیت

پھر بھی سب کو چھوڑ کے اس نے مجھے بنایا میت
جب تک وہ چاہے گی اندھے رہیں گے میرے گیت

اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

"مطربہ"

قتیل کی نظموں کے مضامین وسیع اور متنوع ضرور ہیں مگر زبان و بیان میں وہ اختراع پسند نظر نہیں آتا۔ اس کی نظموں میں لفظوں کا انتخاب ضرور اچھوتا ہے مگر ان میں تخلیقی تصرف نہیں ہے جیسا کہ ہمیں مولانا ظفر علی خان کی نظموں میں ملتا ہے۔

الفاظ کی موزونیت اور غیرموزونیت کا فیصلہ وہ موضوع اور اپنے شاعرانہ تخیل کے معیار پر کرتا ہے۔ طوائف کی عشوہ طرازیاں ہوں یا حسن معصوم کی سادگی ہو، قتیل شفائی شاعرانہ جمالیات سے گریز نہیں کرتا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قتیل کی نظموں میں اس کے بعض ہم عصر شاعروں کے برعکس داخلیت کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ شاعر رنگین مزاج ضرور ہے مگر زندگی کی تلخ حقیقتیں ہمیشہ اس کے رو برو رہتی ہیں اور اس کی شاعری میں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ وہ ایک نظم میں خود کہتا ہے۔

لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے۔
شاعری سچ بولتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ جب میری زباں ڈولتی ہے۔
شاعری سچ بولتی ہے۔

میں نے اس فکر میں کاٹیں کئی راتیں کئی دن۔
میرے شعروں میں ترا نام نہ آئے لیکن۔
جب تری سانس مری سانس میں رس گھولتی ہے۔
شاعری سچ بولتی ہے۔

یہ بھی کیا بات کہ چھپ چھپ کے تجھے پیار کروں۔
گر کوئی پوچھ ہی بیٹھے تو میں انکار کروں۔
جب کسی بات کو دنیا کی نظر تولتی ہے۔
شاعری سچ بولتی ہے۔

دکھائی دیتا ہے۔ ان ہی شاعرانہ محسوسات کی بدولت اس کی قوت بیان نظموں میں اپنے کمال پر ہے۔ غزلوں میں وہ پھر بھی کہیں کہیں رمز و کنائے سے کام لیتا ہے مگر نظم کے میدان میں وہ اپنے جذبوں کو کھل کر بیان کرتا ہے۔ اس کی یہی خصوصیت اسے اپنے دیگر ہم عصر نظم گو شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ مطربہ کو اس کے پورے معاشرتی پس منظر میں سامنے لاتا ہے۔ اس کے سراپے میں وہ ہمیں کوئی ماورائی عنصر نہیں دکھاتا۔ چنانچہ مطربہ کا سراپا اپنے عہد کی تمام اچھائیوں برائیوں اور خود اس کی معاشرتی حیثیت کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن قتیل چونکہ شدت احساس کا شاعر ہے وہ مطربہ کے ہر جائی پن کو معاف نہیں کرتا اس کے غمزہ وادا اور عشوہ طرازیوں کو جھوٹ اور کھوٹ کی ملمع سازی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی معاشرتی حیثیت پر دکھ بھی محسوس کرتا ہے وہ مطربہ کی اس حیثیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

میں اک ایسی دلہن کو جانتا ہوں
جس کی ڈولی نہیں اٹھی اب تک
جس نے دیکھے نہیں کہار ابھی
جس کو چھیڑا نہیں ہے سکھیوں نے
جس سے ڈرتا ہے پی کا دوار ابھی
میں اک ایسی دلہن کو جانتا ہوں
کوئی بابل نہ جس کی ساس نہ نند
جس کا غیروں کے ساتھ جی بہلے
بن چکی ہے جو ماں یتیموں کی

رخصتی کی رسوم سے پہلے

میں اک ایسی دلہن کو جانتا ہوں

"مطربہ"

قتیل نے اپنی بیشتر نظموں میں مروجہ اقدار کی ترجمانی سے انحراف تو نہیں کیا لیکن وہ مزاج اور شاعرانہ محسوسات کے اعتبار سے رومانیت پسند شاعر ہے۔ چنانچہ جہاں معاملات عشق اور قدرت کے مناظر کا حسن سامنے آتا ہے تو اس کا جوہر کھلتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ یہاں وہ ایک سیلابی ریلے کی طرح وادی خار و گل میں اپنا الگ راستہ بناتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہمیں قتیل کے اسلوب اور اس کے موضوع یا مضمون شعر میں مکمل ہم آہنگی نظر آتی ہے جہاں وہ وارفتہ اور ولولہ انگیز ہے وہاں اس کے طرز بیان میں نغمگی بے ساختگی اور تیزی بھی آ جاتی ہے۔

ننگے پیڑوں کو ڈھانپنے کے لئے
پھیلے جاتے ہیں ریشمی سائے

آ گئے وہ پروں کو پھیلائے
غول کے غول سبز پریوں کے

ایک کروٹ سی اور خزاں ناپید
ایک آہٹ سی اور موسم گل

خشک پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ پر
چھا گیا ہے ترانہ بلبل

یوں جھکا ہے ندی پہ اک شہتوت

دیکھتا ہو وہ جیسے آئینہ

پیڑ کا عکس ہے کہ سبز آنچل
جس میں لپٹا ہو نقرئی سینہ

ڈالیاں لد گئی ہیں پھولوں سے
خوشبوؤں سے مہک اٹھے سائے

جیسے گر کے دلہن کے ہاتھوں سے
ناگہاں عطر داں الٹ جائے

"گجر"

قدرتی مناظر حسن کی دل آویز تصویر کشی کے علاوہ قتیل کی شاعری اور خاص طور پر نظمیہ شاعری کی خصوصیت اس کی بحروں کی موسیقی، روانی اور ترنم ہے اس کی ایک نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔

وہی جھنکار وہی ناچتی گاتی تلوار
وہی للکار وہی پھیلتا بڑھتا سا غبار

وہی سیلاب وہی سینۂ دریا کی امنگ
وہی گرداب وہی فطرت امواج کی جنگ

وہی طوفان وہی عزم بغاوت کی دلیل
وہی ہیجان وہی خوف کا احساس علیل

وہی تدبیر وہی زر کا چمکتا ہوا جام
وہی تعبیر وہی خواب کا پھیلا ہوا دام

وہی پیغام وہی صلح کا مبہم اقرار
وہی پیغام وہی ریت کی گرتی دیوار

روز مرہ اور زندگی کے تلخ و ترش معاملات پر نظمیں لکھنے کا راستہ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی نے دکھایا۔ حالی ہی کے اثر کی وجہ سے شرر نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ شرر نے حالی کے اتباع میں مسدس کی طرز پر ایک مسدس "زمانہ اور اسلام" کے عنوان سے لکھی جس کا اردو ادب میں کوئی خاص مقام نہ بن سکا۔ عبدالحلیم شرر کو اردو کی نظمیہ شاعری میں ان کی غیر مقفی نظموں کے تجربے کی وجہ سے ایک نیا مقام ملا۔ غیر مقفی نظم اصل میں انگریزی نظم کی ایک صنف ہے جس میں وزن تو ہوتا ہے مگر قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ انگریزی ادب میں اس صنف کو شکسپیئر اور دوسرے ڈراما نگاروں نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو شاعری میں غیر مقفی نظم متعارف کرانے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے۔ شرر نے اپنے ایک ناول "فلپانا" کو غیر مقفی نظم میں ڈھال کر اپنے رسالے "دلگداز" میں قسط وار چھاپنا شروع کر دیا تھا۔ مشہور نقاد عبدالقادر سروری کے بقول۔

"شرر کی یہ نظم اردو کی سب سے پہلی غیر مقفی نظم ہے اور شاعری کو نظم غیر مقفی سے روشناس کرانے کا فخر ہمیشہ شرر کو حاصل رہے گا"۔

(جدید اردو شاعری۔ صفحہ نمبر ۱۰۳)

حالی کی ہم نوائی میں شبلی نے نظم کو اصلاحی رنگ دینے کے ساتھ ساتھ اسے رجائیت سے بھی ہمکنار کیا۔ اس دور میں شبلی اور حالی کی نظمیں اسلوب کی شگفتگی، خیال کی گہرائی اور بیان کی روانی میں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کے معاصر حیدر آباد دکن کے شاعر رضی الدین حسن کیفی اصلاحی شاعری اور اسلامی تحریکات کی ہم

نوائی میں پیش پیش ہیں کیفی کی نظموں نے دکن کی شاعری میں انقلاب بپا کرنے کا کام انجام دیا۔ بلاشبہ یہ لوگ جدید اردو نظم کے بانیوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو نظم کو غزل کے اثرات سے نکال کر اسے اپنے عہد کے گوناگوں مسائل سے روشناس کرایا۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان لوگوں کے جدید اردو نظم پر بڑے احسانات ہیں۔ جس دور میں وہ پیدا ہوئے وہ اصلاحی دور تھا۔ چنانچہ اصلاح عصر کا عنصر ان کی نظموں میں غالب ملتا ہے۔ انہوں نے اردو نظم کو امیراور داغ کے اثر سے باہر نکال کر اپنے عہد کے مسائل کا شعور دیا۔ آج ہم جدید نظم میں جو حقائق کی جستجو بیان کی سادگی اور جذبوں کا سچا اظہار دیکھتے ہیں وہ ان ہی لوگوں کی سعی کا نتیجہ ہے۔ جدید اردو نظم کے ارتقا کا ذکر یہاں اس لئے کیا جا رہا ہے کہ اس کے تناظر میں جدید نظم اور خاص طور پر زیر تبصرہ قتیل شفائی کی نظموں کے خدو خال زیادہ واضح ہو کر نظر آسکیں۔

جس عہد میں شبلی، آزاد، حالی، کیفی اور بعد میں عبدالحلیم شرر جدید نظم کا احیا کر رہے تھے وہ عہد اصلاحی تحریکات کے علاوہ شکست وریخت کا عہد بھی تھا۔چنانچہ اس فضا میں جو نظم لکھی جا رہی تھی اس پر داخلی کیفیات کی بجائے خارجی واقعات کا اثر حاوی تھا۔ اردو کی قدیم شاعری جن صداقتوں اور حقائق سے محروم ہو گئی تھی ان نظم گو شاعروں نے دوبارہ اس کا سلسلہ شعر سے جوڑا۔ یہ سلسلہ شعرو سخن کی اصلاح سے زیادہ متعلق تھا۔ اور اس زمانے کی فضا کا تقاضا بھی یہی تھا اور اس دور کی ضرورت بھی یہی تھی۔ جدید نظم کے اولین معماروں کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ ان کا زیادہ وقت بوسیدہ دیواروں کو گرانے اور نئی عمارت کی تعمیر میں ہی گزر گیا اور وہ اپنی شاعری میں حسن کاری نہ کر سکے۔ یہ کام آنے والے شاعروں کے ہاتھوں انجام پایا جن کو بقول حامد حسن قادری بنی بنائی عمارت مل گی تھی اور یہ بات بہت حد تک درست بھی معلوم ہوتی ہے۔

اردو غزل نے تو بہت حد تک اپنی قدامت اور روایت کو برقرار رکھا اور اپنے اندر بہت کم تبدیلیاں گوارا کیں لیکن نظم کا دامن بہت وسیع تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ اس کا میدان نیا نیا تھا اور اس میں ہر قسم کے تجربے کئے جا سکتے تھے۔ ابھی اس کی کوئی پختہ اور ثقہ روایت نہیں بنی تھی کم از کم اردو زبان میں یہ اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد، حالی، کیفی اور شبلی کا زمانہ اردو نظم کے بچپن کا زمانہ تھا۔ اسے ہم نظم کا پہلا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس کا دوسرا دور اسماعیل میرٹھی، اکبر آبادی، نظیر اکبر آبادی، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ، میر محبوب علی خان آصف، علامہ اقبال، سید وحیدالدین سلیم، سرور جہان آبادی، پنڈت برج نارائن چکبست، عظمت اللہ خان، احمد حسین امجد، مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور احسان دانش کا دور تھا۔ تیسرے دور میں نظم جدیدیت اور ترقی پسندوں کے عہد میں داخل ہوتی ہے جس کے ذکر سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مقامات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جہاں جہاں سے گزر کر نظم قتیل شفائی تک پہنچی ہے۔ دوسرے دور کی اردو نظم میں اسماعیل میرٹھی سب سے نمایاں ہیں یہ مولانا حالی کے ہم عصر تھے مگر عمر میں حالی سے آٹھ نو سال چھوٹے تھے۔ ان کا زمانہ ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء کا زمانہ ہے۔ ان کی نظموں پر حالی اور شبلی کا رنگ برابر نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ان کی نظموں بہ عنوان "جریدہ عبرت" اور "قلعہ اکبر آباد" میں حالی کا رنگ کار فرما ہے۔ اسی طرح اسماعیل میرٹھی کی دو نظموں "مسلمان اور انگریزی تعلیم" اور "مسلمانوں کی تعلیم" میں شبلی کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن اسماعیل میرٹھی نے حالی اور شبلی کی تقلید نہیں کی بلکہ ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے کچھ انگریزی نظموں کے اردو میں ترجمے بھی کیے۔ لیکن ان کا مطمع نگاہ کبھی بھی فی نفسہ اصلاح نہیں رہا۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسماعیل

میرٹھی شعر کی شعریت کے قائل تھے اور اپنے عہد یا شعر و سخن کے رنگ قدیم کی اصلاح کبھی بھی ان کے پیش نظر نہیں تھی۔

آگرے کے قیام کے دوران اسماعیل میرٹھی نے بچوں کی درسی کتب لکھنے کا کام شروع کیا۔ شروع کی کتابوں میں انہیں مضامین اور نظمیں دستیاب نہ ہوئیں تو انہوں نے خود ان کتابوں کے لئے مضامین اور بچوں کی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ نظموں کی زبان سادہ اور رواں ہو تاکہ پڑھنے والے بچے انہیں آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ اس اصول کو انہوں نے بڑوں کے لئے نظمیں لکھتے وقت بھی پیش نظر رکھا جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں سادگی، سلاست اور روانی نے عروج پایا۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں مقامی رنگ شبلی اور حالی سے زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اردو نظم میں انہوں نے حسن فطرت کی ایک نئے انداز سے نقاشی کی ہے۔ اگر ہم قدیم اور جدید نظم گو شعرا سے ان کا مقابلہ کریں تو ہمیں یہ خاص انداز اسماعیل میرٹھی میں سب سے ممتاز نظر آئے گا۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل میرٹھی نے زیادہ تر بچوں کے لئے ہی نظمیں لکھی ہیں لیکن جب ہم گہری نگاہ سے ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان نظموں میں جذبات کی سچائی، بیان کی سادگی اور شاعرانہ محسوسات کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کی صنعت گری ایسی ہے کہ اس کا تاثر عمر اور زمانے کی حدود کا پابند نہیں رہتا۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں نے اردو نظم کو سادہ بیانی اور حسن بیان کا ورثہ عطا کیا۔ ان کا اسلوب ان کے موضوع کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے ان کی نظمیں دل پر اثر کرتی ہیں ان کے وقت تک اردو نظم مقامی رنگ سے محروم تھی اسماعیل میرٹھی نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ ممکن ہے قتیل نے اسماعیل میرٹھی کو تفصیل سے نہ پڑھا ہو لیکن اس کی شاعری اور خاص طور پر نظموں تک اسماعیل

میرٹھی کا رنگ عہد بہ عہد سفر کرتا ہوا ضرور پہنچا ہے۔ قتیل کے شعری مجموعے گجر کی "نظم" ملاحظہ ہو۔

وادی سربن کی ایک صبح

وادی سربن کی ایک صبح

کوہ سربن کی آغوش گل پوش میں نقرئی بادلوں نے بسیرا کیا
رات بھر بوندیاں رقص کرتی رہیں، بجتی موسیقیوں نے سویرا کیا
ہو گئیں صاف شفاف پگ ڈنڈیاں، میلی میلی چٹانوں کے منہ دھل گئے
سوئی سوئی فضا آنکھ ملنے لگی، سیلی سیلی ہواؤں کے پر تل گئے
وجد میں آگئیں شوکتی جھاڑیاں، مست جھرنے نئے گیت گانے لگے
اونچے اونچے صنوبر لچکتے ہوئے مل کے جشن مسرت منانے لگے
ذرے ذرے کا چہرہ دمکنے لگا، سنگریزوں میں ہیروں سی تاب آگئی
سارا ماحول اک آئینہ بن گیا، روئے فطرت پہ تابندگی چھا گئی
پیارے پیارے پرندے چہکتے ہوئے آشیانوں سے اڑ اڑ کے آنے لگے
ننھے ننھے سے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے کوئی بے نام سا گیت گانے لگے

اسماعیل میرٹھی کی سادہ مگر پر اثر طرز ادا کے اثرات ہمیں قتیل شفائی کے ہم عصر شاعر ابن انشاء میں زیادہ نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کے بعد اکبر الہ آبادی جدید اور قدیم نظم کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ایک طرف تو ان کی نظم شبلی اور حالی سے جڑی ہوتی ہے

اور دوسری طرف اس کے ڈانڈے اقبال کی نظموں سے جا کر مل جاتے ہیں۔ اکبر آبادی کی نظموں میں ان کے عہد کی تمام سماجی' ادبی' سیاسی اور اصلاحی تحریکوں کا سراغ ملتا ہے۔ اکبر کی نظموں میں ہم مغربی نظم کا نقش اول دیکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اکبر کی نظمیں مغربی شاعری اور مغربی رجحانات کے رد عمل کا نتیجہ ہیں۔ اکبر کا دور وہ دور تھا کہ جب مغرب کے اثرات فضا میں ہر طرف محیط تھے۔ اکبر کی نظموں کے موضوع اکثر و بیشتر وہ حالات ہیں جو مغربی تہذیب کی غلامی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کا دور مغربی اثرات کی اصلاح کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ ظرافت اور طنز کے نشتر' اکبر الہ آبادی کی شاعری کا خاص وصف ہیں۔ ان کا یہ وصف ہمیں کہیں کہیں ان کی غزل میں بھی نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بقول عبدالماجد دریا آبادی' اکبر غزل کے شاعر نہیں تھے۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے انہیں کبھی بھی شہرت عام نہیں مل سکی۔ ان کی طبعی ظرافت اور ظریفانہ انداز میں طنز کے نشتر چلانے کا وصف ان کی نظموں میں آکر کھلتا ہے۔ نظموں میں اکبر کا ایک انفرادی انداز اور طرز بیان ہے ان کی نظموں کے شاعری ان کے اپنے زمانے کی بھرپور ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا ایک نصب العین بھی ہمیں نظر آتا ہے ان کا ایک اپنا اسلوب ہے۔ اپنی ایک طرز ادا ہے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ انہیں فطری لگاؤ تھا اسی وجہ سے ان کی تنقیدات کا نشانہ زیادہ تر مسلمان ہی رہے ہیں۔ اکبر نے اپنی نظموں سے مسلمانوں کے اصلاحی اور اخلاق کی تہذیب کا کام لیا۔ اکبر الہ آبادی کا زمانہ ۱۸۴۶ء سے ۱۹۱۱ء تک کا زمانہ تھا۔

اکبر الہ آبادی کے بعد منشی احمد علی شوق قدوائی کا نام آتا ہے انہوں نے اردو نظم میں شاعری اور شعریت کو اولیت کا درجہ دیا۔ اپنے زمانے کی اصلاحی تحریکات سے وہ متاثر ضرور تھے مگر انہوں نے اپنی نظموں میں اس کا اظہار کھل کر نہیں کیا۔ یہ

اردو نظم میں ایک طرح سے داخلی کیفیات کا احیا تھا۔ داخلی کیفیات کے حامل شاعروں کے کلام سے ان کے عہد کے حالات کا علم بہت کم ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شاعروں کی دنیا ان کے دل کے اندر ہوتی ہے۔ وہ اپنی داخلی کیفیات میں مست رہتے ہیں لیکن اگر شاعرانہ محسوسات کی قوت زبردست ہو تو اپنے زمانے کے مشاہدات اور تلخ حقائق ان کے دل میں جذب ہونے کے بعد ان کی شاعری میں ضرور نمودار ہوتے ہیں۔ شوق کی شاعری میں اور خاص طور پر ان کی نظموں میں تنوع ہے۔ وہ حسن مناظر کی تصویر کشی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں برسات اور بہار ایسے مضامین شوق نے اپنی نظموں میں اکثر باندھے ہیں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر جدید شاعروں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ قلم اٹھایا اور مناظر کی رنگینیوں کے تمام نقش تمام رنگ ابھارے۔ شوق کی ایک نظم "عالم خیال" میں ایک بیوی پردیس گئے ہوئے خاوند کے خط کو دیکھ کر اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی نظر آتی ہے۔

خط سے پڑی جگر پہ چوٹ، داغ ہرے ہوئے ہیں آج
تم سے ہزارہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمہارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط، کاش وہ انگلیاں ملیں
میرا خیال چوم لیں جا کے وہیں جہاں ملیں

جدید اردو نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نظم کے قدیم دور کو اس لئے بھی دہرا رہے ہیں کہ ہمیں ان رجحانات کا سراغ ملے جو بغیر کسی کو خبر کئے خاموشی کے ساتھ زمانے کی رو کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور ایک عہد کا ورثہ لے کر دوسرے عہد تک پہنچتے

ہیں۔ خیال تو ایک ہی ہے اس کے اظہار کے انداز مختلف ہیں۔ صبح کے طلوع کا منظر ہر شخص اور ہر شاعر دیکھتا ہے لیکن اسے بیان اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے۔ بعض بے آواز خیال اور نظر نہ آنے والے مناظر ایسے ہوتے ہیں جن کا شعور اور ادراک صرف احساس کی شدت رکھنے والے شاعر ہی کو ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ان دیکھے مناظر اور گمنام خیالوں کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے اور ان کے سگنل ایسے شاعروں اور ادیبوں کے راڈار پر بڑی تیزی سے کھنچے چلے آتے ہیں جن کا اپنا اسلوب منفرد ہوتا ہے اور جو دوسروں کے خیال سے خیال حاصل نہیں کرتے۔ یہ تمہید میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ قتیل شفائی کی ایک نظم کا موضوع بھی خط کی آمد پر محبت کرنے والے کے تاثرات ہی ہیں لیکن قتیل شفائی کے ہاں یہ خط اسے اس کی محبوبہ نے بھیجا ہے۔ یہاں یہ خیال روپ بدل کر قتیل کے پاس آیا ہے۔ قتیل شفائی کی اس نظم کے چند اشعار یوں ہیں۔

تیرے خطوں کی خوشبو
ہاتھوں میں بس گئی ہے سانسوں میں رچ رہی ہے
خوابوں کی وسعتوں میں اک دھوم مچ رہی ہے
جذبات کے گلستاں مہکا رہی ہے ہر سو
تیرے خطوں کی خوشبو

کیا جانے کس طرف کو چپکے سے مڑ چلی ہے
گلشن کے پر لگا کر صحرا کو اڑ چلی ہے
روکا ہزار میں نے آئی مگر نہ قابو
تیرے خطوں کی خوشبو

شوق کے بعد اردو نظم کے ارتقائی عمل میں نظم طباطبائی نظم کہنے کا الگ مزاج لے کر نمودار ہوتے ہیں۔ نظم طباطبائی نے اردو نظم کو جدید اور قدیم اسالیب سے آراستہ کیا۔ ان کی زیادہ تر نظمیں موضوعی ہیں۔ نظم نے اردو نظم میں موضوعی شاعری کے رجحان کو بڑھاوا دیا ان کی بعض نظمیں اس ضمن میں بہت اہم ہیں مثال کے طور پر پھول اور برسات وغیرہ۔ اخلاقی نظموں میں ساقی نامہ' نے شہرت پائی۔ یہ نظم شراب کی مذمت میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم مسلمانوں کی قدیم شائستگی اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اردو نظم کو اپنے زمانے کے صحت مند جدید رجحانات سے بھی روشناس کیا۔ نظم طباطبائی کا تعلق لکھنؤ کے ایک عالم فاضل گھرانے سے تھا اور انہیں خود بھی عربی فارسی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انہوں نے انگریزی زبان کے شاعر گیرے کی ایک مشہور نظم کا "گور غریباں" کے عنوان سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اس نظم کا ترجمہ طباطبائی نے اس مہارت اور دل سوزی کے ساتھ کیا کہ مولانا عبدالحلیم شرر کو بھی یہ کہنا پڑا۔ نظم طباطبائی نے یہ ترجمہ اس کمال کے ساتھ کیا ہے کہ وہی انگریزی کا سوز و گداز قریب قریب اردو میں پیدا ہو گیا ہے۔

جدید اردو نظم کے ارتقائی عمل میں اس نظم کی بڑی اہمیت ہے نظم طباطبائی نے کچھ غیر مقفی نظمیں بھی لکھیں جو اس زمانے کے لئے بالکل اجنبی تھیں۔

ان کے بعد بے نظیر شاہ نے نظم کو مثنوی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں مثنوی کی کلاسیکی حیثیت تو برقرار رہی لیکن شاعری کی نظم ضرور مجروح ہوئی۔ بے نظیر شاہ کے بعد دکن کے شاعروں میں میر محبوب علی خان آصف غزل و نظم کہنے میں سب سے نمایاں ہیں۔ لیکن ان کا میلان طبع غزل کی طرف زیادہ

تھا۔ اس کی وجہ داغ کی نظام حیدر آباد کے دربار سے وابستگی تھی اور داغ کا رنگ اس وقت سب پر چڑھا ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، شبلی اور اکبر الہ آبادی کی نظم کی مساعی کو جس شخصیت نے آگے بڑھا کر اسے جدید ترین قالب میں ڈھالا وہ علامہ اقبال کی شخصیت تھی۔ اقبال کا مرتبہ ہمارے عہد کے شاعروں میں سب سے بلند ہے۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم تھے اسی مناسبت کی وجہ سے اقبال کی نظموں میں غیر ملکی ادب کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ اثرات اقبال کی شروع شروع کی نظموں میں ہی پائے جاتے ہیں چونکہ اس وقت اردو نظم کے ارتقا کی بات کی جا رہی ہے۔ اس لئے یہاں علامہ اقبال کی صرف ابتدائی اردو نظموں کا ذکر ہی مناسب ہے۔ اقبال کی یہ شاعری ان کی موضوعی نظموں کے اولین نقوش ہیں۔ اقبال قدیم طرز کی نظمیہ شاعری سے گریز کرتے ہیں اور فطری شاعری کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اقبال نے نظموں کے موضوع اور شاعری میں شعری فکر کو ایک نیا مقام بھی دیا اور شبلی حالی اور آزاد نے نظم کے ارتقاء کے لئے جو کام کیا تھا اسے بھی تکمیل تک پہنچایا اور آنے والے شاعروں کے لئے نئے در وا کیے۔ اقبال کی اردو قومی اور موضوعی نظمیں پاکیزہ اور دل میں اتر جانے والی شاعری کے اعلیٰ ترین اور پاکیزہ ترین نمونے ہیں۔ ان میں شاعرانہ اظہار خیال اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مولانا آزاد، شبلی، حالی اور اکبر الہ آبادی نے جدید اردو نظم کا جو خواب دیکھا تھا اقبال کی اردو نظمیں اس خواب کی تعبیر ہیں۔

اقبال کی اردو نظمیہ شاعری کا میدان بھی اس قدر وسیع ہے کہ اس مختصر سے جائزے میں اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا میدان سب سے الگ اور سب سے جدا ہے اور وہ اس میدان پر ابر ہمہ گیر کی طرح چھائے

ہوئے ہیں۔ اپنے موضوع مضمون کی بے مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے نظم کے میدان میں چند قدم اور آگے اس عہد کے غزل گو شعرا سے گریز کرتے ہوئے عظمت اللہ خان کے گلستان نظم میں داخل ہوتے ہیں۔ عظمت اللہ خان کا عہد ۱۸۸۷ء سے ۱۹۲۷ء تک ہے ان کا اصلی وطن دلی تھا مگر زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے دکن میں گزارا۔ عظمت اللہ اس وجہ سے دیگر تمام نظم گو شعرا سے منفرد نظر آتے ہیں کہ انہوں نے اردو نظم کو ایرانی اثرات سے نکالنے کی مساعی کی۔ انہوں نے اردو نظم کی بحروں اور اوزان کی بھی تجدید کرنے کی کوشش کی اور یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو نظم بحروں اور اوزان کے اعتبار سے قدیم نظم سے بہت تجاوز کر گئی ہے۔ عظمت اللہ کی نظموں میں داستان گوئی کا عنصر بھی شامل ہے۔ صنف لطیف کی وفا شعاریوں کا بیان ان کی نظموں کا خاص وصف ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا
مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا
مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

الفاظ کی سادگی، سلاست اور بحروں کی روانی ہمیں عظمت اللہ کے عہد سے رواں دواں ہو کر جدید دور کے شاعروں تک آتی محسوس ہوتی ہے۔ قتیل شفائی کی یہ نظم ملاحظہ کیجئے

دلہن جاگ سہیلی
جاگ سنبھل کر آنکھیں مل کر
او البیلی

ہوا سویرا
دیکھ وہ اٹھ کر گیا ندی پر
ساجن تیرا
نیند کی ماتی
اپنی سدھ لے، بول نہ اٹھے
تیری چھاتی
یوں سونے سے
تیرا ان کا بھید کھلے گا
کروٹ بھی لے
او البیلی

عظمت اللہ کے بعد اردو نظم کے افق پر جوش ملیح آبادی نمودار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اردو نظم میں نظریاتی تبدیلیاں لانے کی بھرپور کوشش کی۔ جوش نے نظم کے دامن کو مزید وسیع کیا اور مادی اور ذہنی آزاد خیالی کے رجحانات کو ہوا دی۔ لیکن ان کا لہجہ جوشیلا اور کبھی کبھی درشت ہو جاتا ہے۔ وہ نظم میں سادہ بیانی کی بجائے الفاظ کی شان و شوکت اور شکوہ کے زیادہ قائل ہیں۔

جوش کے بعد مولانا ظفر علی خان نے نظم کو نئے الفاظ بھی دیئے اور اسے ایک ترنم بھی دیا۔ لیکن ان کے سیاسی اور صحافتی کارناموں نے ان کی نظمیہ شاعری کو ایک خاص حد تک محدود رکھا۔ اس کے باوجود مولانا ظفر علی خان نے جتنا بھی لکھا وہ اپنے اسلوب اور تنوع کے اعتبار سے قابل قدر ہے اور اس کے اثرات ترقی پسند شاعروں کی نظموں تک سرایت کرتے نظر آتے ہیں۔

حفیظ جالندھری اپنی نظموں میں اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں ان کی نظموں پر اقبال کا رنگ غالب ہے۔ حفیظ جالندھری حقیقت میں نظم گو شاعروں کے اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہوں نے عظمت اللہ خان کے شعری رجحان کی ترویج کی۔ یہ اردو نظم میں ہندی بحروں کو مروج کرنے اور الفاظ اور تراکیب میں حسن ترنم پیدا کرنے کا رجحان تھا۔ حفیظ جالندھری نے ہندی بحروں کے انتخاب میں زیادہ جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا لیکن اپنی نظموں میں ترنم ریزی کو انہوں نے ہمیشہ پیش پیش رکھا اور اسے بہت اہمیت دی۔ وہ عہد شباب کے نغمہ سرا بھی ہیں۔ نظموں میں غنائیت اور مرقع نگاری ان کا خاص وصف ہے جو ان کی طویل نظم "شاہنامہ اسلام" میں پوری طرح کارفرما ہے۔ حفیظ نے اقبال کی بہترین نظموں کی بحریں بھی استعمال کی ہیں اور ہندی بحروں سے اجتناب کیا ہے۔ حفیظ جالندھری تک آتے آتے اردو نظم میں وضعیت کا رجحان کافی نشو و نما پا گیا تھا۔ وطن سے محبت کا یہ رجحان ہمیں حفیظ کے ہم عصر شاعر افسر میرٹھی میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ افسر کی نظموں میں فطرت پرستی کا عنصر بھی گہرا ہے وہ مناظر قدرت کی تصویر کشی میں انگریزی زبان کے شاعر ورڈز ورتھ سے متاثر ہیں۔ ان کی نظمیں سادگی اور روز مرہ کی اشیاء میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کا عمدہ نمونہ ہیں اور ہمیں دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

اختر شیرانی نے اردو نظم کو جرات اظہار، جدت، تخیل اور رنگین نوائی کا ایک بے باک لہجہ دیا۔ نظم کے پردے میں چھپی ہوئی محبوبہ کو انہوں نے بے نقاب کرتے ہوئے اس سے برملا محبت کا اظہار کیا۔ یہ رجحان ترقی پسند شاعروں اور خاص طور پر قتیل شفائی کی بعض نظموں میں خیال کے اظہار کے حوالے سے واضح تر ہو کر ملتا ہے۔ قتیل شفائی کی یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے۔

اڑا اڑا سا رنگ ہے

وہ آ رہی ہے جس طرح کٹی ہوئی پتنگ ہے

نڈھال انگ انگ ہے

عجیب رنگ ڈھنگ ہے

ایاغ ہے نہ باغ ہے' رباب ہے نہ چنگ ہے

ندامتوں میں جنگ ہے

بجھی بجھی امنگ ہے

یہ راستہ طویل ہے' وہ رہ گزار تنگ ہے

ان الجھنوں پہ دنگ ہے

کدھر مڑے؟

کہاں چلے؟

اردو نظم کے اس پورے تاریخی تناظر میں دیکھیں تو قتیل شفائی کی نظم میں ہمیں ہر دبستان شعر کے گل بوٹوں کی خوشبو اور آرائش ملتی ہے۔ کبھی کبھی شاعر کو خود بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اظہار خیال میں قدیم ورثے سے تصرف کر رہا ہے۔ یہ ایک قدرتی اور تاریخی عمل ہے جو قوموں کے فکر کے علاوہ شاعرانہ خیالات میں بھی جاری و ساری رہتا ہے اور یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔

قتیل شفائی نظم میں بھی جدید ترین عہد اور اس عہد کے فکری اور شعری رجحانات کا شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں عشقیہ مضامین بھی ہیں' جرات اظہار عشق بھی ہے اور وہ اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی تحریکوں سے متاثر بھی ہے۔ اس میں رومانیت پسندی بھی ہے اور وہ زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی بھی نہیں کرتا۔ وہ شاعری کو سچ بولنا سکھانا چاہتا ہے اس کا قلم شعر کی امانت ہے اس کے ضمیر کا نشان ہے

وہ اپنے قلم کی حرمت سے واقف ہے اور اس کا احترام بھی کرتا ہے۔

مرے قلم سے تقاضا ہے شہر یاروں کا
کہ اس کے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا
اگر کہیں نظر آئیں سلگتے ویرانے
قرار دے انھیں ہمسر گلاب زاروں کا
اگر زمیں پہ بلکتے ہوں خاک کے ذرے
گماں ہو ان پہ دمکتے ہوئے ستاروں کا
اگر شباب کے نوحے فضا میں رچنے لگیں
مذاق اڑائے زمانہ ستم کے ماروں کا
اگر کوئی سر بازار بھوک سے تڑپے
سنائے ان کو فسانہ خدا کے پیاروں کا

یہ بھولا بھالا تقاضا ہوا سہی، لیکن
مرے ضمیر کو یہ بندگی قبول نہیں
شرر کو پھول بنانا مجھے نہیں آتا
گھٹا کو زلف سمجھنا مرا اصول نہیں
ترس گئے ہیں اگر ہونٹ مسکرانے کو
تو کس زباں سے کہوں زندگی ملول نہیں
روش روش پہ اگر خار راستہ روکیں
تو کیوں کہوں کہ یہاں سرو ہیں ببول نہیں
مرے قلم نے اگر کوئی بھید کھول دیا
تو اعتراف کروں گا یہ میری بھول نہیں

مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن
مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمت انساں کی آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مورخ ہے جس کے سینے میں
غم حیات کی تاریخ سرسراتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثر اس سے مشیت شکست کھاتی ہے
میں خود اسیر سہی، میرا من اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کی ضمیر نہیں

قتیل شفائی کا انداز بیان اور تشبیہات مشکل نہیں ہیں۔ جزئیات نگاری میں بھی اس کے ہاں روانی اور گہری نقش کاری ہے۔ وہ اکثر ایسی چیزوں کو محسوس کرتا ہے جس کے بارے میں دوسرے غافل ہوتے ہیں۔ قتیل اتنا مشاہداتی نہیں ہے جتنا تخیل پسند ہے۔ قتیل نے نظم میں بھی اپنے ایک انفرادی اسلوب کی آبیاری کی ہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ عصر حاضر کی سماجی کشاکش اور عشقیہ جذبات کی ترجمانی اور موضوعات میں وہ اپنے دوسرے ہم عصر نظم گو شاعروں سے مختلف نہیں ہے لیکن بعض پہلوؤں کی مماثلت کے باوجود قتیل کی نظم ان سب سے الگ نظر آتی ہے روانی طبع اور موضوعات کے تنوع میں بھی وہ اپنے معاصر شعرا سے پیچھے نہیں۔

آج کے سائنسی دور میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرح شعر و ادب میں بھی نئے شعری تصورات اور سائنسی ادراک اور شعور کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارے جدید سائنسی دور کے تقاضے بھی اپنے دور کے مزاج کے مطابق ہیں۔ غزل میں شاعر بہت کچھ رمز و کنائے اور پردہ داری میں چھپا جاتے تھے۔ جن کے پاس کہنے کو کوئی نظریہ یا پیغام نہیں ہوتا تھا ایسے شاعر بھی غزل کے روائیتی تغزل کا سارا لے کر اپنی پردہ داری کر لیتے تھے اور ان کے عیب غزل کی صنعت گری میں چھپ جاتے تھے۔ مگر یہ کمپیوٹر اور ڈش میڈیا کا دور ہے۔ بہت سی ایسی باتیں جو شعر و شاعری کے سات پردوں میں چھپا کر رکھی جاتی تھیں اب کھل کر سامنے آگئی ہیں لوگ شاعروں سے بھی اسی بات کے متمنی ہیں کہ وہ ایسی بات کریں جو ان کی عقل و محسوسات کی پہنچ سے باہر نہ ہو۔ جس میں تجریدیت اور ابہام نہ ہو۔ غزل میں چونکہ حسن و عشق کی روائیتی تہہ داری پہلے سے موجود ہے اور اس کی گائیکی سننے والے کے اعصاب کے لئے کسی حد تک سکون کا باعث بھی ہوتی ہے اس لئے غزل کی صنف سخن کو جہاں وہ بیٹھی ہے جیسے وہ بیٹھی ہے ویسے کا ویسا بیٹھے رہنے دیا گیا ہے۔ لیکن نظم سے ہر قسم کی پوچھ گچھ روا رکھی جاتی ہے۔ نظم ویسے بھی نثر کے زیادہ قریب ہوتی ہے شاعر وہاں رمز و کنائے کی اوٹ میں زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ اسے نظم میں کسی نہ کسی بات اپنے کسی نہ کسی نظریہ شعر یا نظریہ زندگی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے اگر اس کے پاس اپنا کوئی نکتہ خیال یا نظریہ نہیں ہے تو جدید سائنسی عہد کی نظم اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی نظریہ حیات کا ارتکاب کرے۔ اس کا مرتکب ہو چنانچہ آج کے جدید تر دور میں نظم گوئی کا فن زیادہ محنت طلب نظریہ پسند اور علمی تجربات کا متقاضی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے آج نظم کی بجائے غزل لکھنے کی طرف شاعر زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔

قتیل شفائی بھی اب نظم شاذو نادر ہی لکھتا ہے۔ لیکن جو نظمیں وہ لکھ چکا ہے وہ اسے ایک اچھے نظم گو شاعر کے طور پر کتابوں میں محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ قتیل کی نظمیں موضوعات کے تنوع، سادہ بیانی، تخیل کی بلندی اور فن کی پختہ کاری میں اپنے پیش رو اساتذہ کی نظموں کے ہم پایہ نہیں ہیں لیکن وہ ہمیں ان کے ساتھ ان کے قافلے میں ہی سفر کرتا نظر آتا ہے۔ حالانکہ قتیل کے موضوعات اور ان کا تجزیاتی تجربہ اس کا اپنا اور جدید تقاضوں کے مطابق ہے۔ اپنی ایک نظم بہ عنوان "پیش گوئی" میں وہ یوں کہتا ہے۔

سونے کی انگوٹھی میں یہ ہیرے کا نگینہ
تحفہ ترا لیتے ہوئے دل کانپ رہا ہے
آغاز میں انجام کی باتیں، مرے محبوب
احساس کی رگ رگ میں لہو ہانپ رہا ہے

یہ خواب جو میں نے تری آنکھوں سے نچوڑا
افسوس کہ اس خواب کی تعبیر غلط ہے
میں نے تو نہ چاہا تھا یہ سونے کا دریچہ
شاید ترے فردوس کی تعبیر غلط ہے

افسوس تری مصلحت اندیش محبت
دل سے نہیں، سونے سے مجھے تول رہی ہے
لیکن مرے محبوب اسے کون چھپائے
وہ راز جو ہیرے کی کنی کھول رہی ہے

ڈھل جائیں گے جس وقت شفق زار لبوں سے

جب حسن کے شاداب نظارے نہ رہیں گے
جب چاند سے ماتھے پہ نہ پھوٹے گا اجالا
جب رات سی آنکھوں میں ستارے نہ رہیں گے

ہو جائے گا عریاں تری فطرت کا تلوّن
ہیرے سے اتر جائے گا سونے کا لبادہ
جس وقت میں رہ جاؤں گا آفاق میں تنہا
ہیرا مرے کام آئے گا سونے سے زیادہ

قتیل کی نظموں میں کہیں کہیں ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ چلتے چلتے وہ اپنے اصل موضوع کو بھول گیا ہے۔ متذکرہ بالا نظم میں اس کی اس کمزوری نے نظم کے آخری بند میں ابہام کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ توضیحات تو بہت ہو سکتی ہیں لیکن اس حقیقت سے قتیل کی نظموں کا قاری بہت جلد واقف ہو جاتا ہے کہ قتیل موضوع کے اظہار اور تجزیہ میں دقت محسوس کرتا ہے اور اسی وجہ سے ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی وارداتیں عام طور پر قتیل کی ان نظموں میں پیش آتی ہیں جن کے موضوعات کا تعلق انسانی نفسیات اور ذہن کے داخلی محسوسات سے ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر لفظوں کے چناؤ میں بھی اس سے انصاف نہیں ہوتا اور اس کے سامنے جو پہلا لفظ آتا ہے وہ اسے اٹھا کر نظم میں جڑ دیتا ہے۔ ایسے الفاظ بالعموم ٹھیک طرح سے نہیں جڑتے اور پوری نظم کا تاثر زائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چونکہ میں قتیل شفائی کو ایک عرصے سے جانتا ہوں اس مناسبت سے مجھے اس کی اس کمزوری کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ وجہ قتیل شفائی کی خود پسندی ہے وہ اپنے شعر کے ہر لفظ کو ہر حرف کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اگر اسے کسی سے شرف تلمذ رہا ہوتا تو شاید وہ اس عیب سے محفوظ رہتا۔ بلکہ میں صرف اتنا کہوں

گا کہ قتیل کو اپنی شاعری سے الگ ہو کر اپنے اشعار پر ناقدانہ نظر ضرور ڈال لینی چاہیے۔ خاص طور پر اسے ایسے الفاظ کو استعمال کرتے وقت جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے جن الفاظ کو وہ اپنی خاص اختراعات سمجھتا ہے۔ کیونکہ آدمی کے وہاں دھوکا کھانے کا بہت امکان ہوتا ہے جہاں اسے اعتماد زیادہ ہو۔

ماسوائے اس کے قتیل شفائی کی نظمیں اپنے مخصوص رنگ سخن' طرز ادا اور بیان کے اسلوب کے زمرے میں ہم عصر شعرا کی نظموں سے بالکل الگ اور منفرد مقام کی حامل نظر آتی ہیں۔ عشق و محبت کی جسمانی مسرتوں اور جسمانی اذیتوں کے احساس نے قتیل شفائی کی نظموں کو زمین' شہروں اور انسانوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔ وہ ماورائی حسن کی رمزیت اور اشاریت کے طلسم زاروں کا قائل نہیں ہے۔ ایسی رمزیت اور ابہام ہمیں اس کی غزلوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ نظموں میں تو اس نے زیادہ کھل کر بات کی ہے۔ وہ شاعرانہ تخیل کے اظہار میں جرات رندانہ سے کام لیتا ہے اور اپنے سے پہلے کے بعض شاعروں کی طرح نظریاتی اور جذباتی پیچیدگیوں میں نہیں الجھتا۔ اگرچہ خود اس کے عہد میں بعض ابہام پسند شاعروں نے نظم کو داخلی واردات میں اس قدر الجھا دیا ہے کہ ان کی نظموں کا کوئی سرا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن قتیل شفائی کی انفرادیت پسندی نے اسے بچا لیا اور وہ زندگی کے مشاہدے اور حقائق زندگی کے مطالعے کے نئے نئے زاویے تخلیق کرتا چلا گیا۔

نظم معرا یا بے قافیہ نظم مغربی شاعری کی درآمدات میں سے ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اردو زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی گئی اور ن م راشد کے زمانے میں نظم معرا' یا اردو شاعری کی ایک فنی خصوصیت بن کر ابھری ہے قتیل نے بھی چند ایک بے قافیہ نظمیں لکھیں۔ لیکن ان میں خیال اور موضوع کا اچھوتا پن نہیں ہے لگتا ہے کہ وہ محض لکھنے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔

Scanned by CamScanner

دو عادتیں

مری دو عادتیں تھیں
ایک سگریٹ' ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگریٹ نہیں چھٹتا
کہا میں نے
کہ اے میرے جہاں دیدہ رفیقو' دوستو
سن لو!
تمہارے تجربوں سے معذرت کرتے ہوئے
سگریٹ کو چھوڑا آج سے میں نے
مگر وہ میری محبوبہ؟
وہ اب دہرا سرور زندگی دینے کو
سگریٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگریٹ کی کمی محسوس وہ مجھ کو
مری اب ایک ہی عادت ہے

محبوبہ!

نظم کے میدان میں جو سیاسی سماجی اور اصلاحی تحریکیں "برگد" ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئیں اور جن تحریکوں نے اردو نظم کو ایک وسیع تر ماحول عطا کیا وہ ماحول اور تحریکیں اب اردو نظم کے ساتھ نہیں رہیں۔ فضا اور زمانے کا مزاج تبدیل ہو گیا ہے۔ فلم' ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے نظم کی بجائے گیت کو فروغ دیا ہے اس لئے

قتیل شفائی کے گیتوں کی شاعری پر بات بے حد ضروری ہے لیکن قتیل شفائی کے گیتوں کی فضا میں داخل ہونے سے پہلے میں اس کی ایک نظم "ایکٹریس" آپ کو ضرور سنانا چاہوں گا۔

تھر تھراتی رہی چراغ کی لو
اشک پلکوں پہ کانپ کانپ گئے
کوئی آنسو نہ بن سکا تارا
شب کے سائے نظر کو ڈھانپ گئے

کٹ گیا وقت مسکراہٹ میں
قہقہے روح کو پسند نہ تھے
وہ بھی آنکھیں چرا گئے آخر
دل کے دروازے جن پر بند نہ تھے

سونپ جاتا ہے مجھ کو تنہائی
جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بنتی جاتی ہوں نخل صحرائی
تو نے چاہا تو میں نے مان لیا
گھر کو بازار کر دیا میں نے
بیچ کر اپنی ایک ایک امنگ
تجھ کو زردار کر دیا میں نے

○

گیت

قتیل شفائی کے گیتوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا بڑا ضروری ہے کہ اردو گیت کا شجرہ نسب کیا ہے۔ یہ اردو شاعری میں کہاں سے وارد ہوا۔ اساتذہ نے شاعری کی اس صنف پر نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اردو شعر کے ابتدائی اور درمیانی دور میں شاعری کی اس صنف پر توجہ نہیں دی گئی۔ ان ادوار میں اردو شعر پر فارسی کا اثر غالب رہا۔ دکن میں دوہے ضرور لکھے گئے ہیں لیکن ان پر ایک خاص مذہبی عقیدے کا رنگ بڑا گہرا نظر آتا ہے۔

آل احمد سرور نے اس صنف شعر کو غنائی شاعری سے تعبیر کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس صنف کو غزل اور نظم سے کوئی الگ مقام نہیں مل سکا اور غنائی شاعری کا عنصر غزل میں ہی شامل ہو گیا۔ میرا جی کا کہنا ہے کہ گیت قدیم سنسکرت اور مقامی ہندی بولیوں کی شاعری کی ایک صنف ہے۔ جس نے گیارہوں صدی سے پہلے ہندی ادب کی کلاسیکی زبانوں سنسکرت وغیرہ میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ میرا جی کے قول کے مطابق ہی اس صنف شاعری کا اولین اظہار گیتوں کی شکل میں ہندوستان کے راجہ پرتھوی راج کے درباری شاعر چندر بروائی کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن

مجھے میرا جی سے اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سنسکرت شاعری میں گیت کا تصور سب سے پہلے سنسکرت کے شاعر اشو گھوش نے دیا۔ اشو گھوش پہلی صدی عیسوی کا بڑا نامور شاعر تھا وہ پاٹلی پتر(پٹنہ) میں مقیم تھا۔ کنشک راج اسے اپنے ساتھ پشاور لے گیا تھا۔ اشو گھوش سنسکرت کی معروف صنف شاعری کاو' کا استاد مانا جاتا ہے مہاتما گوتم بدھ کی سوانح عمری میں اشو گھوش نے گوتم بدھ کی کپل وستو میں آمد کا منظر تین تین اور چار چار مصرعوں میں بیان کیا ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنے ایک مضمون میں ان مصرعوں کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں سنسکرت کے اولین گیتوں سے تعبیر کیا ہے۔ ٹیگور کے اس مضمون کو جو انہوں نے انگریزی میں لکھا تھا میں نے آج سے قریبا چالیس برس پہلے السٹرئیٹڈ ویکلی آف انڈیا میں پڑھا تھا۔ افسوس کہ وہ رسالہ اب میرے پاس نہیں ہے ورنہ میں اس کا پورا اقتباس ترجمہ کر کے یہاں درج کرتا۔

دسویں صدی عیسوی میں بنگال میں کانولیٹ نام کا ایک شاعر ہو گزرا ہے اسے جے دیو کے بعد بنگالی زبان میں عشقیہ گیتوں میں ایک اہم مقام حاصل تھا ان کے بعد چنڈی داس نے گیت کو عاشقانہ واردات اور جذبات محبت کو زبردست توانائی عطا کی۔ ان سے بھی پہلے "امارو" نام کے ایک سنسکرت شاعر نے گیت کی شکل میں عاشقانہ جذبات کو بھر پور انداز میں بیان کیا تھا۔ جے دیو اور چنڈی داس نے گیت کی اس روایت کو آگے بڑھایا اور بعد میں اس صنف شاعری کے ڈانڈے سنسکرت کی فضاؤں سے نکل کر ہندی زبان سے جا ملے۔ جے دیو کے گیتوں میں دیومالائی عنصر زیادہ ملتا ہے وہ رادھا اور کرشن کی بھگتی میں مگن ہے۔ چنڈی داس نے حقیقی دنیا میں رہنے والی "رامی" نام کی ایک عورت سے بے پناہ محبت کی اور اسی کی محبت میں سرشار ہو کر گیت لکھے۔ "امارو" کے گیتوں میں عورت کے جسمانی حسن اور جسم کی لذتوں کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ "امارو" سنسکرت کا شاعر تھا۔ اور وہ صرف محبت اور خاص طور پر

عورت سے محبت کے گیت گاتا ہے اور اس کے نزدیک عورت سے محبت کے جذبات کو بیان کرنا ہی اس کی نظموں اور گیتوں کا مقصد ہے "امارو" کی نظمیں زیادہ مختصر نہیں ہیں لیکن گیتوں میں وہ اختصار سے کام لیتا ہے مگر ان میں جذبات اور بیان کی شدت زیادہ ہے۔ امارو، جے دیو کے زمانے سے پون صدی پہلے کے زمانے میں پیدا ہوا تھا ایک روایت کے مطابق وہ "بکما جیت" کے رتنوں میں شامل تھا۔

ہمارا موضوع سخن اس وقت امارو شاعر کے سوانح حیات سے نہیں ہے ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ گیت نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا۔ یہ بات طے ہے کہ اس صنف شاعری کا منبع سنسکرت کی قدیم شاعری ہے جہاں سے اس چشمے نے پھوٹ کر ہندوستان کی مختلف شمالی زبانوں میں اپنی جگہ بنائی اس کی نشو و نما ہوئی اور آخر میں وہ ہندی شاعری میں آکر مل گیا۔ مغلوں کی آمد سے پہلے اس صنف شاعری کا شمالی ہند میں بڑا عروج تھا۔ جب بنگال میں مسلمانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو قدرتی طور پر مسلمانوں کے رہن سہن، طرز معاشرت اور رنگ ثقافت کا اثر وہاں کی شاعری پر بھی پڑا اور بنگالی زبان اور بنگالی شاعری میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہونا شروع ہو گئے لیکن یہ عمل ست رفتار تھا انگریزوں کی آمد کے بعد جب کلکتے کو انہوں نے اپنا دارالحکومت بنایا اور فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو اردو فارسی کے اثرات گہرے ہوتے چلے گئے۔ چونکہ گیت کی شاعری میں زیادہ تر مقامی عنصر غالب ہوتا تھا اور صرف محبت کی داخلی کیفیات کو ہی یا زیادہ سے زیادہ محبوبہ کے سراپا کو ہندی دیومالائی پس منظر کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا اس لئے گیت کی صنف شاعری کے نازک خیال فارسی عربی کے فلسفیانہ اور سنجیدہ تصور شعر کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور یہ صنف شعر پس منظر میں چلی گئی۔

اس صنف شاعری یعنی اردو گیتوں کا احیا کب ہوا؟ کس کے ہاتھوں ہوا؟ اس کا

مستند طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے واسطے بڑی ریسرچ کی ضرورت ہے اس کے لئے اردو شاعری کے کئی آثار قدیمہ کھودنے پڑیں گے اور ہم اپنے اصل موضوع یعنی قتیل شفائی کے گیتوں سے دور ہو جائیں گے۔ ہم اس موضوع پر بھی اس وقت بحث نہیں کریں گے کہ گیت نے بھگتی لہر کی شاعری میں جب بھجن کی شکل اختیار کی تو اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم وقت اور فاصلے کو تیزی سے طے کرتے ہوئے اردو کے ایک ایسے شاعر تک پہنچیں جس نے اردو غزل میں فارسی اور عربی الفاظ کو نکال باہر کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ مگر جس کو شہرت اس کے فلمی گیتوں کی وجہ سے ملی۔ اس شاعر کا نام "آرزو لکھنوی" تھا۔ "آرزو لکھنوی" کے شعری مجموعے "سریلی بانسری" میں اس کے جو گیت شائع ہوئے ہیں ان میں صرف ان گیتوں کو اپنے عہد میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی جو آرزو صاحب نے نیو تھیٹرز کی فلموں کے لئے لکھے تھے۔ کہنے کو تو وہ فلمی گیت ہیں اور آرزو صاحب نے فلموں کے لئے ہی لکھے تھے۔ لیکن ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ پر کلاسیکی گیتوں کا درجہ رکھتی ہے۔

گیت کی شاعری میں عام طور پر محبت کی سطحی جذبات نگاری کی جاتی ہے۔ گیت کا تعلق انسان کے جذباتی پہلو سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں فکر کی گہرائی نہیں ہوتی۔ لیکن آرزو لکھنوی کے گیتوں میں ہمیں محبت کے جذبات کے علاوہ کہیں کہیں فکر کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں مگر اس خیال سے کہ گیت کا نازک مزاج مجروح نہ ہو آرزو لکھنوی فکر کے تصور کو رمز و کنائے میں ابھارتے ہیں ان کے ایک غیر فلمی گیت کا ایک بند یوں ہے۔

تیرے دیئے میں کتنا تیل' دیکھ تو کتنی رات گئی
دوہری بتی دھک دھک کر کے سانجھ کو بھور بنائے
پی بھور سے پہلے پہلے دیا نہ گل ہو جائے
دیکھ تو کتنی رات گئی

ان کے ایک اور فلمی گیت کا یہ شعر یا دو مصرعے دیکھیں

کچھ جو پتہ تو اس کا پائے
کیا منہ لے کر سامنے جائے

آرزو لکھنوی کے ایک گیت کی یہ نادر تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ہوئی جگت اجیاری دیکھو
بن گئی جاگی آنکھ کا کاجل
سمٹ کے رین اندھیاری

آرزو لکھنوی کے ہم عصر ترقی پسند اور ادب پسند شاعروں نے بھی گیت لکھے جو ادبی رسالوں میں چھپتے رہے مگر اس صنف پر کسی شاعر نے بھی آرزو کے بعد پوری توجہ نہیں دی۔ یہ اردو شعرو شاعری کا بڑا بھرپور دور تھا اور اس دور میں نظم کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں حفیظ جالندھری نے گیت ضرور لکھے مگر ان کے گیتوں تک آتے آتے اس صنف شاعری نے ہندی الفاظ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ حفیظ کے گیتوں میں ہمیں عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ہندی الفاظ کہیں کہیں محبوب کی نشانی کی طرح نظر آتے ہیں بلکہ حفیظ کے اکثر و بیشتر گیتوں پر انکی نظم کا رنگ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

فلم کے عروج کا دور شروع ہوا تو گیت ادبی رسالوں سے نکل کر پردہ سیمیں پر آگئے۔ قیام پاکستان کے بعد شروع شروع میں پاکستانی فلمی گیتوں پر ہندی گیتوں کے اثرات قائم رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کے پیش نظر ہندی الفاظ ترک کر دئے گئے اور فلمی اور ادبی گیت خالص اردو گیتوں کی شکل اختیار کر گئے۔ قتیل شفائی دونوں طرز کے گیتوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

اس کے فلمی گیت اردو زبان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں لیکن ادبی گیتوں میں ہندی کے نرم و نازک الفاظ شاخوں پر کھلے ہوئے پھولوں کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے فلمی گیتوں میں غزل اور نظم کا رنگ نمایاں ہے صرف بحریں چھوٹی ہیں لیکن اپنے فلمی گیتوں میں بھی وہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ایک فلمی گیت کے یہ مصرعے دیکھیں۔

یہ وادیاں' یہ پربتوں کی شاہ زادیاں
پوچھتی ہیں' کب بنے گی تو دلہن
میں کہوں جب آئیں گے مرے سجن
مرے سجن چلا بھی آ

قتیل شفائی کے فلمی گیتوں کا مجموعہ زیر طبع ہے اس کے سارے فلمی گیت اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں یہ چند ایک مثالیں ہیں ان سے قتیل شفائی کے فلمی گیتوں کا ادبی رتبہ ضرور ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جن جذباتی کیفیات پر قتیل نے فلموں کے لئے گیت لکھے ہیں اور لکھتا ہے ان جذباتی کیفیات کا تجربہ اسے روز مرہ زندگی کے واقعات میں بھی ہوتا ہے چنانچہ فلم سے ہٹ کر جب وہ گیت لکھتا ہے تو ان جذبات کی مکمل طور پر اور موثر انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ

ایک حساس شاعر ہے اور اس کے پاس اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اپنا ایک الگ لہجہ ہے اس لئے قتیل شفائی کے ادبی گیتوں اور فلمی گیتوں میں ہم کوئی فرق نہیں دیکھتے وہ الفاظ کی دلکشی اور خوش آہنگی کو کبھی موضوع اور مقصدیت سے مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اگر کسی جگہ اپنے گیتوں میں قتیل شفائی نے کسی اجتماعی مسلک کو بھی اختیار کیا ہے تو وہاں بھی اس نے گیت کے ترنم خیال کی جدت اور نغمے کی غنائیت کو برقرار رکھا ہے۔

دنیا اک بازار
قدم قدم بیوپار

لیکن میرے یار ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہوگا
اس بازار کے ہر گوشے میں راج ہے ان دلالوں کا
ہمیں غلام بناتے آئے ہیں جو دولت والوں کا

جیت گئے اس بار
دولت کے انبار

لیکن میرے یار ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہوگا
کوئی بجائے چین کی بنسی کالے دھن کی چھاؤں میں
کوئی ناچے سونا چاندی باندھ کے اپنے پاؤں میں

اونچی ساہو کار
مفلس کا گھربار

لیکن میرے یار، ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہو گا
جانے کب سے دین دھرم کا پڑا ہوا ہے کال یہاں
بنا ہوا ہے صدیوں سے انسان بکاؤ مال یہاں

بکتا ہے کردار
نہیں مجھے انکار

لیکن میرے یار ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہو گا
چاہے ساجن کی پگڑی ہو، چاہے زیور گوری کا
ساری ساری رات لگا رہے دھڑکا ان کا چوری کا

بن گئے چور چکار
شہر کے پہرے دار

لیکن میرے یار، ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہو گا
اب تک ہم کو ڈالتے آئے جو قسمت کے چکر میں
کھلے جائیں گے محنت اور سرمائے کی ٹکر میں

اونچی ہے اس بار
سونے کی دیوار

لیکن میرے یار، ہمیشہ ایسا کبھی نہ ہو گا

اس گیت میں قتیل نے ایک خوش آئند انقلاب کا خواب دیکھا ہے۔ لیکن جہاں محبت کے لطیف اور نازک جذبوں کا اظہار کرتا ہے تو اس کے صریرِ خامہ سے پائل کی جھنکار کا ترنم سنائی دیتا ہے۔

ناچے مور پپیہا گائے
سن سن مورا من لہرائے
آس لگی تیرے آون کی
گھر آئی بدریا ساون کی

مرے آنگن جب کوکی کوئلیا
کیا کیا یاد تم آئے رے چھلیا
سدھ نہ رہی موہے تن من کی
ترس گئی میں درس دکھا جا
اڑ کے کسی بدلی سنگ آجا
پیاس بجھے مری اکھین کی
گھر آئی بدریا ساون کی

اور یہ گیت دیکھیے۔ اس میں شاعرانہ تخیل کی تنہائی کا احساس بڑی شدت سے ابھرتا ہے۔ گیتوں کی تنگنائے شعر ایسے فکر خیز سمندری ریلے کی متحمل نہیں ہوا کرتی لیکن قتیل شفائی بڑی مہارت اور کمال فن کے ساتھ اس مقام پر آشوب میں سے گزر گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جب رات کا گہرا سناٹا کچھ گاتا ہے
ترا پیار مجھے یاد آتا ہے
تری چپ آنکھیں مجھے یاد آتی ہیں
جو مجھ کو بھاتی ہیں غزلیں
کھو جاتا ہوں جب تری آنکھوں میں

تب ذہن میں آتی ہیں غزلیں

مری سوچوں پر اک سایہ سا لہراتا ہے
ترا پیار مجھے یاد آتا ہے

یاد آتی ہیں وہ ساری باتیں
جو تیرے لبوں پر آ نہ سکیں
میں جن کے بھید سمجھتا رہا
جو خود کچھ بھی سمجھا نہ سکیں

مرے دھیان میں آکر جب بھی تو شرماتا ہے
ترا پیار مجھے یاد آتا ہے

یہ بزم نہیں تنہائی ہے
یہاں دل کا کالا کوئی نہیں
دو بول رسیلے بول بھی دے
یہاں سننے والا کوئی نہیں

کیوں پہلے جیسی چپ کو پھر دہراتا ہے
ترا پیار مجھے یاد آتا ہے

اسی شاعرانہ اور قلب کی داخلی وارداتوں کی تنہائی کا احساس قتیل شفائی کے اس گیت میں بھی پوری شدت کے ساتھ موجزن ملتا ہے۔

جب شام اکیلی آتی ہے
مت پوچھو' کیا ہوتا ہے

مری آس خیالوں کے دھندلے سایوں میں کھو جاتی ہے
جب شام اکیلی آتی ہے

میں دیکھنے لگتا ہوں رستہ ان وعدوں کا
اک رنگ جھلکتا ہے جن میں کچھ یادوں کا
ہلچل سی دل میں، دھڑکن میں شور سا ہونے لگتا ہے

مت پوچھو کیا ہوتا ہے
جب شام اکیلی آتی ہے

یہ لوٹ چکیں مجھ کو کتنے ہی ناموں سے
میں پیار کئے جاؤں پھر بھی ان شاموں سے
جو میرا غم ہے، نغموں کے روپ میں سامنے آتا ہے
مت پوچھو کیا ہوتا ہے
جب شام اکیلی آتی ہے

میں آہٹ سنتا تھا پہلے کچھ گیتوں کی
وہ آہٹ نذر ہوئی جانے کن ریتوں کی
مرے دل کی جب سے ٹوٹی ہے آس یہ مجھ پر ہنستا ہے
مت پوچھو کیا ہوتا ہے
جب شام اکیلی آتی ہے

قتیل نظموں اور غزلوں کے برعکس اپنے گیتوں میں الفاظ کا چناؤ کرتے وقت گیت کی نازک مزاجی کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ایسے الفاظ سے اجتناب کرتا ہے جن سے گیت

کے آبگینے کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہو اس کے گیتوں کے مجموعے "گھنگھرو" کا پہلا ہی گیت اس امر کی گواہی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بادل برسے چھم چھم شاعر گیت لکھے
وہ ہر گاتے موسم کو اپنا من میت لکھے
بادل برسے چھم چھم شاعر گیت لکھے

نکھرے ہوئے نغمات سنے وہ مستانہ
بکھرے ہوئے جذبات چنے وہ دیوانہ
دھڑکن دھڑکن ساز بجاتا جائے وہ
بادل کے سنگ آپ بھی گاتا جائے وہ

چپ رہنے کو ڈرے ہوئے لوگوں کی ریت لکھے
بادل برسے چھم چھم شاعر گیت لکھے

سنے ملہاریں یوں برکھا کی محفل میں
جھانکتا بھی جائے وہ بوندوں کے دل میں
دیکھے وہ تصویر ہر اک پس منظر کی
باہر بیٹھ کے دیکھے دنیا اندر کی

اسی لئے وہ سنانے کو بھی سنگیت لکھے
بادل برسے چھم چھم شاعر گیت لکھے

اور اب ہم قتیل شفائی کے جس گیت کا ذکر کرنے والے ہیں اس میں شاعر کا زور طبع لفظوں میں بھی سیلاب کا شور بن کر ظاہر ہوا۔ لگتا ہے سمندر کی موجیں ساحل کی

چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ خطرہ تھا کہ یہ سیلاب گیت کے نازک آبگینے کو توڑ کر نکل جائے گا لیکن یہ شاعر کے فن کا کمال ہے کہ اس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ملاحظہ ہو۔

مجھے آئی نہ جگ سے لاج
میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

کچھ مجھ پہ نیا جوبن بھی تھا
کچھ پیار کا پاگل پن بھی تھا
کبھی پلک پلک مری تیر بنی
کبھی زلف مری زنجیر بنی

لیا دل ساجن نے جیت
وہ چھیڑے پائلیا نے گیت
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

دھرتی پہ نہ میرے پیر لگیں
بن پیا مجھے سب غیر لگیں
مجھے رنگ ملے ارمانوں کے
مجھے پنکھ لگے پروانوں کے

جب ملا پیا کا گاؤں
تو ایسا لچکا میرا پاؤں
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

قتیل شفائی کے ہاں، خصوصیت کے ساتھ اس کے گیتوں میں پاکیزہ جذبات کی معصومیت بھی جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس گیت میں قتیل شفائی نے ایک اداس بھائی کے جذبات کی بڑی خوبی سے ترجمانی کی ہے جو بہن کے سسرال جانے کے خیال جانے سے آزردہ ہے۔

مری بہنا، ہمیشہ تم سکھی رہنا
محبت ہو تری چنری، شرافت ہو ترا گہنا
مری بہنا، ہمیشہ تم سکھی رہنا

ابھی میکے میں ہو اور کل تجھے سسرال جانا ہے
جو صدیوں کی پرانی ریت ہے اس کو نبھانا ہے
خیالوں میں دلہن کا سرخ جوڑا تو نے پہنا ہے

مری بہنا، ہمیشہ تم سکھی رہنا
کریں گی تیری سکھیاں پیار سے تیرا سنگھار اک دن
اٹھے گی تیری ڈولی اور بنوں گا میں کہار اک دن
نہ ہو کوئی سکھی تو اپنا سب کچھ تو مجھے کہنا
مری بہنا، ہمیشہ تم سکھی رہنا

ضرورت پر وفا میری تجھے اپنا لہو دے گی
وہیں میں اڑ کے پہنچوں گا جہاں آواز تو دے گی
کوئی دکھ ہو تری خاطر مجھے ہنس ہنس کے سہنا ہے
مری بہنا، ہمیشہ تم سکھی رہنا

قتیل شفائی کی شاعری کا یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے ایک دریچہ وا کیا ہے جس میں سے گذر کر آپ قتیل کی شخصیت اور اس کے فن شعر تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے کوئی حکم نہیں لگایا۔ یہ کام قتیل کے پڑھنے والوں اور آنے والی نسلوں کا ہے۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ کہ قتیل کی شخصیت اس کی شاعری اور اس کے فن شعر کے نقوش اس طرح ابھاروں کہ شاعر کے شخصی اور شعری خد و خال پوری جزئیات کے ساتھ آپ کے سامنے آجائیں اور آپ اس کی شاعری کے ہر پہلو کو اچھی طرح جانچ سکیں اور اس سے متعارف ہو سکیں۔

○

قتیلؔ اس شہر میں آخر بنائیں کس کو ہم ساتھی
کہ لاکھوں مومنوں میں ایک بھی کافر نہیں ملتا

نشانِ منزل

قتیل شفائی ہمارے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے ادب کو زندگی بنایا ہے۔ یہ ان کے لئے رفع الوقتی کوئی چیز نہیں۔ وہ اپنا ایک فلسفہ زندگی اور انداز نظر رکھتے ہیں جس کی بنیاد انسان دوستی پر ہے۔ اس باب میں ان کا ثبات قابل داد ہے

احمد ندیم قاسمی

استادوں کے سائے میں، ہم عصروں کے ہجوم میں شعر کہنا شاید خود سیکھا مگر میرے بہت سے گیتوں بلکہ لفظوں کا ترنم اکثر اوقات برادر محترم قتیل شفائی کی یاد دلاتا ہے۔ سینئر تو ہیں لکھتے بھی بہت اچھا ہیں۔ مجھ سے کہیں بہتر۔

جمیل الدین عالی

میرے دل میں قتیل شفائی کی شاعری اور شخصیت کی قدر ہے۔ وہ ہمارے عہد کے سینئر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ملنسار، خوش گو اور خوش طبع ہیں اور اپنے عہد کے مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔

احمد فراز

شاعری میں مصوری اور موسیقی کو تحلیل کرنے کا کام تو تمام قدیم و جدید اچھے شاعروں نے کیا۔ مگر قتیل شفائی کے سوا رقص کو کسی نے شاعری میں تحلیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا؟

قتیل شفائی اردو کے طرح دار اور البیلے شاعرہیں۔ ان کے نغموں کی جھنکار من موہ لینے والی ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت کا جادو ان کے وطن سے لے کر پوری اردو دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔

پروفیسر محمد حسین

اور خود قتیل شفائی اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

میں نے اپنی بڑائی کا دعوی کبھی نہیں کیا اور نہ آئندہ ایسی جسارت کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یہ حق تو حاصل ہے کہ میں اپنے کلام کی مقبولیت پر خوشی کا اظہار کر سکوں۔ اگر میری خوشی میں آپ بھی شریک ہو جائیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ میرے قدردان ہی نہیں دوست بھی ہیں۔ یہ درست ہے کہ استادان فن ہمارے لئے کچھ سانچے بنا کر چھوڑ گئے ہیں جن میں لفظوں کو "ڈھال دیا جائے تو گھڑے گھڑائے شعر حاصل ہونے لگتے ہیں۔ شکر ہے کہ مجھے ان سانچوں کی ضرورت کبھی نہیں محسوس ہوئی بلکہ لفظوں کو میں نے وہی خدو خال دیئے ہیں جو میرے اپنے شعور نے مجھے دکھائے۔ چونکہ ذات اور کائنات کا سفر میں نے اپنی فکر و نظر کے پروں پر طے کیا اس لئے اسلوب کا افق بھی میرے اپنے خوابوں کے مانند تھا جو پل پل نکھرتا چلا گیا۔ لمحہ لمحہ سنورتا گیا اور اب ..... میں سوچتا ہوں کہ اپنے اسلوب کے افق پر میں کہاں تک

جگ مگا سکوں گا۔ میں اسلوب کے افق سے آگے ایک اور افق دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایسا افق جس پر زندگی کی رنگین دھنک بارش میں بھیگے ہوئے آنچل کا سماں باندھ رہی ہے اور میں اس نئے افق کی جانب اڑا چلا جا رہا ہوں۔ نئے رنگوں کی تلاش میں......

قتیل شفائی

یہ وہ آرا ہیں جن کا اظہار ملک کی چند ایک نامور ادبی شخصیات نے شاعر رنگین مزاج قتیل شفائی کے فن اور کسی حد تک ان کی شخصیت کے بارے میں کیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قتیل شفائی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیسے کیا؟ کہاں سے کیا؟

بھوک سہہ کر بھی جو لکھتے رہے سچ بات قتیلؔ
ساری بستی میں وہی اہل قلم اچھے ہیں

قتیل شفائی کی تصانیف

بیس شعری مجموعے۔

ہریالی، گجر، جلترنگ، روزن، جھومر، مطربہ، چھتنار، گنگھرو، پیراہن، آموختہ، ابابیل، برگد، گفتگو، سمندر میں سیڑھی، پھوار، صنم، پرچم

ان کے علاوہ چودہ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات رنگ خوشبو روشنی، تین جلدوں میں اور تمام تر کلام سے منتخب مجموعہ، انتخاب

ادبی صحافتی سرگرمیاں

ماہنامہ ادب لطیف لاہور، ہفت روزہ اداکار، لاہور، ہفت روزہ اجالا۔ لاہور ماہنامہ سنگ میل۔ پشاور سے وابستگی کے علاوہ پاکستان رائٹرز گلڈ (مغربی پاکستان) کی سکریٹری شپ کے لئے دو مرتبہ منتخب ہوئے اور کم و بیش سات برس تک یہ اعزازی خدمات انجام دیتے رہے۔

اعزازات

تمغہ حسن کارکردگی (ادب) حکومت پاکستان ۱۹۹۳ء۔
عالمی اردو کانفرنس سے امیر خسرو ایوارڈ۔
شعری مجموعے مطربہ پر آدم جی ایوارڈ۔
چھتنار اور پیراہن' پر اباسین آرٹس کونسل سرحد کے دو ایوارڈ' حکومت پاکستان کا نیشنل قلم ایوارڈ۔

○

(پہلی قطار میں کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں)
حسن طاہر۔ شریف کنجاہی۔ عبداللہ ملک۔ حمید اختر۔ اکرم افگار۔ جمیل ملک
(بیٹھے ہوئے دوسری قطار)
طفیل احمد خان۔ عبدالمجید بھٹی۔ احمد ندیم قاسمی۔
(بیٹھے ہوئے تیسری قطار میں)
اے حمید۔ احمد راہی۔ قتیل شفائی

(باغ جناح میں چوہدری برکت علی مالک مکتبہ اردو کی جانب سے دی گئی ایک دعوت میں)